چند نعت گویانِ اُردو

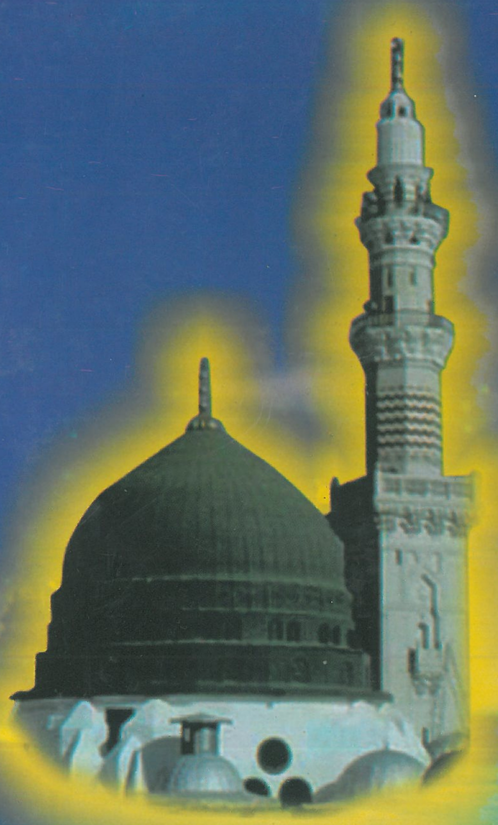

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

چند نعت گویانِ اُردو

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

الوقار پبلی کیشنز

ڈاکٹر فرمان فتح پُوری ستارۂ امتیاز

ایم۔اے۔ایل ایل بی، بی، ٹی، پی ایچ، ڈی، ڈی، لٹ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صفِ اوّل کے محقق و نقاد ہیں۔ دو سو سے زائد قیمتی مقالات اور تین درجن سے زائد بلند پایہ کتابوں کے مُصنّف ہیں۔ غالب، اقبال، انیس، حسرت موہانی، محمد علی جوہر اور نیاز فتح پوری پر اُن کی فکر انگیز مُستند کتابیں ہیں۔ قومی زبان اور تحریکِ پاکستان کے تعلق سے سرسیّد، قائدِ اعظمؒ اور ہندی اُردو تنازع کے زیرِ عنوان، اُردو اور انگریزی میں اُن کی دستاویزی مطبُوعات، سیاسی و اَدبی تاریخ میں حوالہ بن گئی ہیں۔ زبان و مسائلِ زبان، شاعری و اصنافِ شاعری، ادبی تاریخ و تذکرہ نگاری اور اُردو فِکشن، ان کی تحقیق و تنقید کے خاص موضوعات اور ان کی وُسعت مُطالعہ کے اِمتیازی نشانات ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پُوری پاکستانی جامعات کے پہلے اُستاد ہیں جو اُردو زبان و ادب میں بیک وقت، پی ایچ، ڈی اور ڈی، لٹ کی اعلیٰ اَسناد رکھتے ہیں۔ متعدد قومی اور بینُ الاقوامی اجتماعات میں شرکت کر چکے ہیں۔ مُلک میں بطور اسکالر توقیر و تکریم کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں حکُومتِ پاکستان نے اُنھیں سب سے بڑے سِول اعزاز ''ستارۂ امتیاز'' سے سرفراز کیا ہے۔ دیگر اداروں کے علاوہ کراچی یونیورسٹی سنڈیکیٹ بھی اُنھیں متعدد بار نقد انعام اور طلائی تمغہ دے چُکی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پُوری ۱۹۵۸ء میں شعبۂ اُردوہ جامعہ کراچی سے منسلک ہو کر پروفیسر اور چیئرمین کے منصب تک پہنچے۔ ۱۹۸۵ء میں وفاقی حکومت کی جانب سے ڈپوٹیشن پر اُردو ڈکشنری بورڈ کے سکرٹیری اور چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پاکستان کی بیشتر جامعات اور علمی و ادبی اداروں کی مختلف کمیٹیوں کے رُکن اور پی ایچ، ڈی کے طلبہ کے نِگران ہیں۔ ۱۹۶۲ء سے علامّہ نیاز فتح پوری کے بِنا کردہ ماہنامہ ''نگار'' بھی ان کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

اس وقت اُردو کی ایک جامع لغت کی ترتیب اور بعض دوسرے علمی و ادبی منصوبوں کی تکمیل میں سرگرم ہیں۔

چند نعت گویانِ اُردو

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

(ستارۂ امتیاز)

الوقار پبلی کیشنز

335-K2 Wapda Town, Lahore.

جملہ حقوق محفوظ

ناشر : سید وقار معین
0300-8408750
0321-8408750
042-35189691-2

سال اشاعت : 2010ء

طابع : گنج شکر پریس، لاہور

قیمت : -/395 روپے

انتساب

اپنے مرحوم بڑے بھائی سید شمشاد علی تنہا
کے نام جن کا میری تعلیم وتربیت میں
سب سے زیادہ حصہ ہے۔

فرمان فتح پوری

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	کتاب سے پہلے — ڈاکٹر فرمان فتح پوری	
۱۔	مولانا احمد رضا خان منفرد نعت گو شاعر	۹
۲۔	اقبال ایک ممتاز اور اہم نعت گو	۲۰
۳۔	علامہ سیماب اکبر آبادی کی نعت گوئی	۳۲
۴۔	محشر رسول نگری کی مسدس ''فخرِ کونین'' پر ایک نظر	۴۳
۵۔	امین راحت چغتائی کا نعتیہ کلام ''محرابِ توحید''	۵۷
۶۔	عبدالعزیز خالد کی نعتیہ شاعری پر ایک نظر	۶۱
۷۔	حضرت ستار وارثی کی نعتیہ شاعری	۸۰
۸۔	رشید وارثی کا شعری مجموعہ ''خوشبوئے التفات''	۸۷
۹۔	''زادِ آخرت'' کا شاعر جامی بدایونی	۹۱
۱۰۔	''نغمۂ عندلیب'' سید محمد یوسف علی کا نعتیہ مجموعہ	۹۵
۱۱۔	مدحتِ رسول ﷺ اور زاہد فتح پوری	۹۸
۱۲۔	راقم علیگ کا شعری مجموعہ ''طائرِ معرفت'' پر ایک نظر	۱۰۱
۱۳۔	مبارک مونگیری ''ذکرِ ارفع'' کی روشنی میں	۱۰۵

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۴۔	حنیف اخگر کے مجموعہ حمد و نعت و منقبت ''خلقِ مجسم'' پر ایک نظر	۱۰۹
۱۵۔	''اعجازِ مصطفیٰ ﷺ'' کا شاعر۔ اعجاز رحمانی	۱۱۷
۱۶۔	''سرورِ کائنات ﷺ'' کا شاعر۔ گہر اعظمی	۱۲۳
۱۷۔	پروین جاوید، کیف پرور نعتوں کی امین	۱۲۶
۱۸۔	''چراغِ اطلس'' کا شاعر۔ محبوب الٰہی عطا	۱۳۲
۱۹۔	طاہر سلطانی کی نعتیہ شاعری	۱۳۶
۲۰۔	عبدالمالک مضطر کی نعتیہ شاعری	۱۴۲
۲۱۔	''حمد و ثناء'' نثار بیانوی کا شعری مجموعہ	۱۴۸
۲۲۔	رضی عظیم آبادی کی نعتیہ شاعری	۱۵۲
۲۳۔	''چراغِ مصطفوی ﷺ'' سراج الدین سراج کا مجموعۂ کلام	۱۵۶
۲۴۔	''المدد یا سیدی یا رحمت اللعالمین'' راؤ مبین کا نعتیہ مجموعہ	۱۶۱
۲۵۔	''ساقیِ کوثر ﷺ'' خان اختر ندیم نقشبندی کا نعتیہ مجموعہ	۱۶۵
۲۶۔	''خورشیدِ بطحا'' حنیف ساجد کا نعتیہ مجموعہ	۱۶۷
۲۷۔	''الہام'' خالد عرفان کا نعتیہ مجموعہ	۱۷۱

کتاب سے پہلے

نعت عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی تعریف یا وصف بیان کرنے کے ہیں۔ مثلاً فارسی کے اس شعر میں

جاوید ہمی باش بہ ایں نعت بایں وصف
پاکیزہ باخلاق و پسندیدہ بافعال

نعت کا لفظ اپنے لغوی معنی ہی میں استعمال ہوا ہے لیکن ادبیات اور اصطلاحاتِ شاعری میں نعت کا لفظ اپنے مخصوص معنی رکھتا ہے۔ یعنی اس سے صرف آنحضرت ﷺ کی مدح مراد لی جاتی ہے۔ شاعری کی مختلف ہیئتوں مثلاً قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ یا مسدس و مخمس وغیرہ کسی بھی ہیئت میں نعت کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے موضوع سے انحراف یا تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔

تاریخی حیثیت سے اُردو میں نعت گوئی کی روایت نئی نہیں بہت پُرانی ہے اتنی ہی پُرانی جتنی خود اُردو شاعری۔ قدیم دکنی شعراء سے لے کر آج تک اُردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے نعتیہ اشعار نہ کہے ہوں، اس حوالے سے قدیم شعراء کے نعتیہ کلام کے بارے میں میری کتاب 1974ء میں شائع ہوئی اور اُردو نعتیہ ادب کے حوالے سے اُردو میں پہلی کتاب قرار پائی۔ اس کے بعد کئی دوسرے اہلِ قلم کی کتابیں بھی منظرِ عام پر آئیں۔ کئی حضرات نے تو پورے مقالات لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ مثلاً ڈاکٹر ریاض مجید

کا مقالہ ''اُردو میں نعت گوئی'' اقبال اکادمی پاکستان سے 1990ء میں شائع ہوا جس میں انہوں نے میری کتاب کے بارے میں لکھا۔

''نعت کے بارے میں شائع ہونے والی پہلی اہم تصنیف ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اُردو کی نعتیہ شاعری'' 1974ء ہے۔ جس میں علمی و تحقیقی انداز میں نعت کے فکر و فن کے ضروری پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ سید رفیع الدین اشفاق کا مقالہ ''اُردو میں نعتیہ شاعری'' اگرچہ 1953ء میں مکمل ہوا مگر اس کی اشاعت 1976ء میں ہوئی۔ ان کتابوں کی موجودگی نے مواد کی فراہمی کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کے نئے نئے گوشے سمجھائے''۔ (صفحہ۔ن)

گویا نعت گوئی کا سلسلہ جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔

میں نعتیہ ادب کے بارے میں اپنی پہلی کتاب کی اشاعت کے بعد بھی نعتیہ ادب کے حوالے سے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ کبھی تفصیلی مضمون کی صورت میں کبھی کسی نعتیہ مجموعہ کے دیباچے کے طور پر کبھی کسی مجموعۂ کلام پر تبصرے کے انداز میں مگر یہ تمام تحریریں منتشر حالت میں تھیں۔ برادرم محمد اصغر کاظمی نے توجہ دلائی کہ ان منتشر تحریروں کو یکجا کر دیا جائے تو اُردو میں نعت گوئی کے حوالے سے ایک معلومات افزا کتاب منظر عام پر آجائے گی اور نعت گوئی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نعت گوئی پر کام کرنے کے لئے نئے نئے دروازے کھل جائیں گے۔

محمد اصغر کاظمی صاحب کا مشورہ میرے دل کو لگا اور میں نے اُن کی مدد

سے اپنی بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کرنا شروع کیا۔ اب یہی منتشر ذخیرہ ''چند نعت گویانِ اُردو'' کے عنوان سے کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ مجھے یقین ہے یہ نعت کے باب میں آپ کی معلومات میں اضافہ کرے گا اور آپ کی دلچسپی میں بھی اضافہ کرے گی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مولانا احمد رضا خاں

منفرد

نعت گو شاعر

شاعری، خواہ اس کا موضوع کچھ بھی ہو، شاعر سے جذبے کی شدت اور پاکیزگی کا مطالبہ کرتی ہے۔ جذبے کی شدت اور پاکیزگی سے مراد یہ ہے کہ شاعر اپنے موضوع سے مخلص ہو، گہرا لگاؤ رکھتا ہو اور اپنی لگن میں سچا ہو، اس سچائی اور لگن کو غالب نے دل گداختہ کا نام دیا ہے۔ اقبال نے خونِ جگر کہا ہے اور بعض نے شاعر کے خلوص سے تعبیر کیا ہے جس نسبت سے شاعر کے جذبات سچے، ملتہب اور گہرے ہوں گے اسی نسبت سے اس کی شاعری سچی، موثر اور گہری ہوگی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ جذباتی صداقت کے بغیر منطقی یا علمی صداقت کے زور پر اعلیٰ درجے کی شاعری جنم نہیں لے سکتی۔ کسی شخص کا علمی تجربہ اس کا ناقل وتفکّر اور مشاہدہ ومطالعہ ممکن ہے بلند پایہ تصنیف وتالیف کے لئے مددگار ثابت ہو۔ لیکن تخلیقِ شعر میں معاون نہیں ہوسکتا۔ خاص طور پر نعتیہ شاعری علم وفکر کے ساتھ ساتھ شاعر کے جذباتِ محبت کا ایسا ارتعاش والتہاب چاہتی ہے جو مولانا احمد رضا خانصاب بریلوی کی طرح اس بات پر والہانہ یقین رکھتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کائنات میں بے مثال ہے، نہ ماضی میں اس کی مثال نظر آتی ہے اور نہ حال میں، اور نہ مستقبل میں اس کی مثال کا امکان ہے۔ کہنے کا

مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی شاعر پورے وثوق، مکمل یقین اور پوری شدتِ جذبات کے ساتھ یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو کہ

لم یاتِ نظیرک فی نظرٍ، مثلِ تو نہ شُد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہہ دوسرا جانا

اور جب تک اس عقیدے پر عامل نہ ہو اس وقت تک نہ تو کوئی شاعر صفِ اوّل کا نعت گو شاعر کہا جا سکتا ہے نہ اس کی نعتیہ شاعری دوسروں کو مسحور و متاثر کر سکتی ہے اور نہ اس میں وہ شگفتگی و دل آویزی پیدا ہو سکتی ہے جو مندرجہ بالا شعر میں نظر آتی ہے۔ اس شعر میں یا اس نعت کے دوسرے اشعار میں جو اثر آفرینی اور دلکشی ہے وہ صرف اس سبب سے نہیں کہ اس میں مولانا احمد رضا خانصاب نے غیر معمولی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے اور ہر شعر میں عربی، فارسی، اُردو اور پوربی بولی کی فنکارانہ پیوند کاری سے ادب کے قارئین کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ زبان و بیان کے سلسلے میں اس نوع کی قادر الکلامی دوسرے شعراء کے یہاں بھی ملتی ہے بلکہ اُردو شاعری کی تاریخ میں الفاظ کی شعبدہ گری و صنائع لفظی میں کمال دکھانے والے شاعر بہت سے ہیں۔ لیکن صاحبِ نقد و نظر خوب واقف ہیں کہ محض کمالاتِ لفظی کی بناء پر انہیں بڑا شاعر تسلیم نہیں کیا گیا۔ میر و سودا، آتش و ناسخ، ذوق و غالب، امیر و داغ اور میر حسن و دیا شنکر نسیم کے نام ہماری تاریخ میں ساتھ ساتھ لئے جاتے ہیں۔ ان تقابلی مطالعات پر درجنوں مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ طلبہ سے لے کر اساتذہ تک ان کی شاعرانہ خصوصیات

کا موازنہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کوئی صاحبِ ذوق اور انصاف پسند ناقد، سودا کو میر پر، ناسخ کو آتش پر، ذوق کو غالب پر، امیر کو داغ پر اور نسیم کو میر حسن پر ترجیح نہیں دے سکتا، حالانکہ زباندانی اور لفظی صناعی کے جتنے کرتب سودا، ناسخ، ذوق، امیر اور نسیم کے یہاں دکھائے گئے ہیں۔ میر، غالب، آتش، داغ اور میر حسن کے یہاں نظر نہیں آتے۔ یہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ شاعری کا حقیقی تعلق الفاظ و تراکیب سے نہیں، جذبات و محسوسات کی سچائی اور گہرائی سے ہے۔ چنانچہ مولانا احمد رضا خانصاب بریلوی کی مذکورہ بالا نعت میں بھی جو دل نشینی و دل آویزی اور لطافت ہے وہ اس بنا پر ہے کہ آنحضرت ﷺ سے بے پناہ محبت کا صاف و شفاف چشمہ اس کی تحت میں بہ رہا ہے۔ مستی اور والہانہ پن کا ایک آبشار ہے جس کی طراوت، خنکی اور مٹھاس سے اہلِ دل سیراب ہو رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور یہ نعت محض لفظی صناعی کا ایک نمونہ ہوتی تو ہرگز زبان زد خلائق نہ ہوتی، اس کی مقبولیت حلقہ خواص سے نکل کر عوام تک نہیں پہنچتی اور اس کے اشعار سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے سوا کوئی اور لطف نہ لے سکتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کوئی شخص اس کے الفاظ کو پوری طرح سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔ اس میں جذبات کی ایسی شدت، ایسی صداقت اور ایسی گہرائی ہے کہ سننے اور پڑھنے والوں کے دل خود بخود اس طرف کھنچتے ہیں اور جب کبھی کسی محفل یا جلسے میں یہ نعت خاص لحن سے پڑھی جاتی ہے سامعین خواہ ان کی علمی و ادبی سطح کچھ بھی ہو۔ وجد میں آجاتے ہیں اور جھوم جھوم اُٹھتے ہیں اور خود کو حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ

میں حاضر محسوس کرتے ہیں۔دل کشی و اثر پذیری کا جادو اس نعت میں حضرت احمد رضا بریلوی کی جذباتی صداقت نے جگایا ہے ورنہ سچ بات یہ ہے کہ انہیں مختلف زبانوں کی پیوند کاری اور الفاظ و تراکیب کا شعبدہ دکھانا مقصود نہ تھا۔ایک فطری اور خلاق شاعر کی حیثیت سے وہ پوری طرح محسوس کرتے تھے اور ایک با شعور ناقد کی طرح خوب جانتے تھے کہ اعلیٰ درجہ کی شاعری، الفاظ سے نہیں بلکہ درونِ خانہ کے ہنگاموں یعنی شدید جذباتی تلاطم اور تموج سے وجود میں آتی ہے بات یہ ہے کہ شاعری ایک طرح کا شعوری عمل ہو کر بھی سراسر شعوری عمل نہیں ہے۔شعر کہے نہیں جاتے، بنائے نہیں جاتے ہیں۔شعر کے لئے الفاظ جوڑے نہیں جاتے، قافیے تلاش نہیں کئے جاتے، استعارات و کنایات اور تراکیب و محاورات، دانستہ تراشے نہیں جاتے بلکہ شعرا اپنے پورے وجود کے ساتھ خود بخود ذہنِ شاعر پر نازل ہوتا ہے۔دنیا کے ہر بڑے اور حقیقی شاعر نے شعر گوئی کے سلسلے میں یہی کہا ہے اور حضرت احمد رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری بھی اس خاص معیار پر پوری اُترتی ہے۔ ہر چند کہ جس نعت خاص کا ذکر اس جگہ کیا گیا وہ احباب کی فرمائشیں پر کہی گئی ہے اور جیسا کہ اس نعت کے مقطع میں ہے۔

بس خامۂ نوائے رضا نہ یہ طرز تیری نہ یہ رنگ ترا
ارشادِ احبا ناطق تھا ناچار اس راہ پڑا جانا

مولانا احمد رضا خاں صاحب نے خود واضح کر دیا ہے کہ نہ تو ان کا یہ رنگِ سخن تھا اور نہ اس طرزِ شاعری سے ان کی طبیعت کو کوئی مناسبت تھی صرف

احباب کے حکم کی تعمیل میں اُنہوں نے ایسا کیا اور اپنی غیر معمولی قادر الکلامی کا لوہا منوالیا۔ورنہ یہ حقیقت ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری بنیادی طور پر فلسفیانہ موشگافیوں یا علم و فن کی بھول بھلیّوں کی شاعری نہیں بلکہ حضور اکرم ﷺ کی ذات و صفات سے گہری وابستگی اور شدید جذباتی لگاؤ کی شاعری ہے۔ان کی نعتیہ شاعری پر معصومیت، شفیتگی، سادگی اور عاشقانہ سرمستی کی جو چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور یہ چاندنی قاری کے درونِ خانہ میں جس قسم کا مدوجزر پیدا کرتی ہے وہ بے سبب نہیں ہے۔جذبات اپنے اظہار و ابلاغ میں کسی خاص قسم کی لغات، تراکیب اور استعارات کا سہارا نہیں لیتے بلکہ فطری انداز میں روزمرہ کی زبان میں انتہائی سادگی سے خود بخود ظاہر ہو جاتے ہیں۔حقیقی جذبہ، خواہ اس کا تعلق محبت سے ہو یا نفرت سے، خوف سے ہو یا جستجو سے، غم سے متعلق ہو یا خوشی سے، مصنوعی سہاروں کا محتاج نہیں ہوتا، اپنے نمود و اظہار کی راہ خود پیدا کر لیتا ہے بلکہ بعض اوقات تو جذبے کے اظہار کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔آدمی کے چہرے بشرے، رفتار، حرکات و سکنات اور نشست و برخاست سے جذبات خود بخود نمایاں ہو جاتے ہیں۔اس لئے گہرے اور سچے جذبات کی عشقیہ شاعری خواہ اس کا تعلق مجاز سے ہو یا حقیقت سے اپنی تفہیم و ترسیل کے لئے کسی لغت یا شرح کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ خود بخود عام و خاص ہر قسم کے قاری و سامع کے ذہن و قلب میں اُتر جاتی ہے مجازی سطح پر اُردو شاعری کی تاریخ میں میر تقی میر کی عشقیہ شاعری اس کی ایک واضح مثال ہے۔عشقِ رسول اور نعت گوئی کے حوالے سے یہی

صورت مولانا احمد رضا خاں صاحب کی شاعری کی ہے جس طرح ان کے جسم کا رُواں رُواں آنحضرت ﷺ کی محبت سے سرشار ہے اسی طرح اُن کی نعتیہ شاعری کا ایک ایک لفظ عشقِ رسول میں ڈوبا ہوا ہے اور حضور اکرم ﷺ سے گہرے جذباتی لگاؤ کا مظہر ہے۔ اس لئے حضرت بریلوی کی نعتیہ شاعری جتنی زیادہ سادہ ہے اتنی ہی زیادہ...... پُرکار بھی ہے اور اپنے قاری اور سامع کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی، رئیس المتغزلین مولانا حسرتؔ موہانی خود عاشقانِ رسول ﷺ میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے شعر کے متعلق حکم لگایا ہے کہ

شعر دراصل ہے وہی حسرتؔ
دل میں سنتے ہی جو اُتر جائے

مولانا احمد رضا خاں صاحب کی نعتیہ شاعری اس معیار پر پوری اُترتی ہے جو شخص ان کے اشعار سنتا ہے سر دھنتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتا گویا وہ اپنے ذوقِ سخن کا مذاق اڑواتا ہے۔

عاشقانہ جذبات کے اظہار میں سادگی اور پاکیزگی کا جو رچاؤ شروع سے آخر تک حضرت رضا بریلوی کے مجموعہ نعت حدائق بخشش میں نظر آتا ہے، وہ اُردو کے دوسرے نعت گو شعرا کے یہاں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ اُن کے یہاں غزل کے پیرائے میں لمبی لمبی نعتیں ملتی ہیں اور بعض نعتوں میں بڑی مشکل زمینوں اور ردیفوں میں طبع آزمائی کی گئی ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی محبت کا تیز دھارا سنگلاخ زمینوں کو چیرتا ہوا اس طرح گزر گیا کہ شادابی اور زرخیزی کے جو

آثار مولانا احمد رضا خاں صاحب کی ان نعتوں میں پیدا ہو گئے ہیں وہ دوسروں کے ہاں نرم اور ہموار زمینوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ میری مراد ایسی نعتوں سے جو جن میں بعض کے مطلع اس انداز کے ہیں کہ

سر تا بقدم ہے تنِ سلطانِ زمن پھول
لب پھول دہن پھول زمن پھول بدن پھول

عارض شمس و قمر سے بھی ہیں انور ایڑیاں
عرش کی آنکھوں کے تارے ہیں وہ خوشتر ایڑیاں

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفےٰ ﷺ کہ یوں
کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں

یادِ وطن ستم کیا دشتِ حرم سے لائی کیوں
بیٹھے بٹھائے بدنصیب سر پہ بلا اُٹھائی کیوں

ہے لبِ عیسیٰ سے جاں بخشی نرالی ہاتھ میں
سنگریزے پاتے ہیں شیریں مقالی ہاتھ میں

ان زمینوں میں اچھے شعر کہنا وہ بھی نعت میں جس میں قدم اُٹھانا بقول

عرفی تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے جسے توفیقِ الٰہی میسر ہو اور عشقِ رسول ﷺ کی سرشاری و سرمستی کے ساتھ زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہو۔ برصغیر پاک و ہند کے علمائے دین میں بڑے بڑے صاحبِ علم و دانش اور علوم دینی و دینوی کے فاضل گزرے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو ایک معتبر و متجر عالم و فقیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ صف اوّل کا شاعر بھی ہو یا جس نے نعت گوئی میں کوئی ممتاز مقام پیدا کیا ہو۔ اس اعتبار سے مولانا احمد رضا خاں صاحب کی شخصیت بالکل منفرد اور یکتا ہے۔ وہ برصغیر کے ایک ایسے جیّد عالم ہیں جن کا حلقہ اثر دوسرے علماء کے مقابلے میں سب سے بڑا ہے اور ایک ایسے نعت گو شاعر ہیں جن کی نعتیں نہ صرف یہ کہ سب سے زیادہ مقبول ہیں بلکہ ان کی شاعری اس پایہ کی ہے کہ ان کا نام صرف اُردو کے ممتاز ترین شاعروں کے نام کے ساتھ لیا جانا چاہئے۔

جہاں تک خالص نعتیہ شاعری کا تعلق ہے اُردو میں جو قبول عام مولانا احمد رضا خاں صاحب کی شاعری کو میسر آیا کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ ان کے ہم عصروں میں محسن کاکوروی کا نام یقیناً ایسا ہے جن کا معیار نعت گوئی کم و بیش وہی ہے جو مولانا احمد رضا خان صاحب کی نعتوں کا ہے۔ لیکن محسن کاکوروی کے مجموعہ نعت میں سے صرف ایک قصیدۂ لامیہ اور ایک مثنوی ابرِ کرم کو ہی مقبولیت حاصل ہوسکی۔ ان نظموں سے بھی صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی متعارف ہے۔ بات یہ

ہے کہ ان میں زبان و بیان کے سلسلے میں علامات و استعارات کا جو اہتمام اور معیار پیش نظر رکھا گیا ہے اس سے خاص خاص لوگ ہی لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس احمد رضا بریلوی کی نعتیں اپنی مخصوص سادگی و پُرکاری کے سبب عام و خاص میں یکساں مقبول ہیں۔ ہمارے ہاں اُن کی نعتیں مخصوص محفلوں سے لے کر سیرت النبی ﷺ کے عام جلسوں تک میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں، شاید ہی کوئی مسلمان باذوق ایسا ہوگا جسے احمد رضا بریلوی کی درج ذیل نعتوں کے دو چار شعر نہ یاد ہوں

واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

لَم یاتِ نظیرک فی نظرٍ مثلِ تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سرسو ہے تجھ کو شہہ دوسرا جانا

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے
مرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

نعتیہ غزلوں سے قطع نظر مولانا احمد رضا خاں صاحب کا سلام جس کا مطلع ہے

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ رسالت پہ لاکھوں سلام

کو بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اکبر وارثی میرٹھی کا سلام

یا نبی سلام علیک
یا رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک
صلوٰۃ اللہ علیک

بھی حد درجہ شہرت رکھتا ہے۔ عورت، مرد، بچے، جوان سب ہی اسے بلند آواز سے پڑھنا پسند کرتے ہیں لیکن اس کے بعد اگر کسی سلام کو قبول عام کا درجہ ملا ہے تو وہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کا سلام ہے۔ حفیظ جالندھری کے

شاہنامے کا ایک ٹکڑا جس میں ولادتِ نبوی کا ذکر ہے اور ماہر القادری کی نظم ''حدیث قدسی'' جس میں آنحضرت ﷺ پر درود و سلام بھیجا گیا ہے۔ کو بھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ بہت دنوں تک وہ ہر محفل اور ہر جلسے میں پڑھے گئے۔ لیکن نہ جانے کیوں جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کی مقبولیت میں کمی ہوتی گئی۔ اب وہ کسی محفل میں شاذ و نادر ہی سننے میں آتے ہیں۔ اس کے برعکس مولانا احمد رضا خاں صاحب کا سلام اگرچہ ڈیڑھ سو سے زائد اشعار پر مشتمل ہے اور حفیظ جالندھری اور ماہر القادری کے سلاموں سے قدیم اور طویل تر ہے پھر بھی آج تک بڑے اہتمام اور کثرت سے پڑھا جاتا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب ممتاز ترین نعت گو ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول ترین نعت گو شاعر بھی ہیں۔

اقبال ایک ممتاز
اور
اہم نعت گو

حالی کی بعد نعت کے موضوعات اور اسلامی قدروں کے موید شعرا میں سب سے ممتاز اور اہم نام اقبال کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حالی کی طرح علامہ اقبال کو بھی رسمی معنی میں نعت گو شاعر نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ ان کے یہاں رسمی انداز کی صرف ایک دو نعتیہ غزلیں ملتی ہیں۔ وہ بھی ان کے بالکل ابتدائی دور کی ہیں۔ مثلاً ان کی وہ نعت جس کا مطلع ہے

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

اسی دور کی یادگار ہے لیکن نعت کے غیر رسمی معنوں میں علامہ اقبال اُردو کے اہم ترین نعت نگار ہیں۔ انہوں نے صرف یہی نہیں کہ اپنی شاعری میں سیکڑوں جگہ آنحضرت ﷺ کی سیرت و کمالات کا والہانہ اظہار کیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان کی پوری شاعری کا حقیقی محور سیرتِ محمدی اور اسوۂ رسول ﷺ ہے حتیٰ کہ ان کے فلسفۂ خودی کا اصل الاصول بھی یہی ہے۔ اسرارِ خودی سے لے کر جاوید نامہ تک ان کے فکر و فن کا نقطۂ آغاز بھی رسالت ہے اور نقطۂ ارتقا و اتمام بھی رسالت ہے۔ رسالت کی تعریف رموزِ بے خودی کے ابتدائی صفحوں

میں انہوں نے اس طور پر کی ہے

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزار دمایک است
جزوما از جزو مالا ینفک است
ازمیان بحرِ اوخیزیم ما
مثلِ موج ازہم نمی زیزیم ما
دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہِ ح مشعلے افروختیم
ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
ایں کہ یک جانیم از احسانِ اوست
قوم راسرمایہ قوت ازو
حفظِ سرِّ وحدتِ ملت ازو

جبکہ یہ بات صرف رسالت کی توصیف و تعریف تک نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے فلسفہ خودی کے عناصر ترکیبی میں بنیادی عنصر عشقِ رسول ہی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جب خودی دوسرے ارتقائی منازل سے گزر کر آنخضرت ﷺ کی محبت سے سرشار اور فقر و استغنا سے مستحکم ہو جاتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں اس کے قبضے میں آ جاتی ہیں۔

از محبت چون خودی محکم شود
قوتش فرماں دہ عالم شود
پنجہ او پنجہ حق می شود
ماہ از انگشتِ او شق می شود

اس قسم کے اشعار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے خودی کے ذریعے جو فلسفہ حیات پیش کیا ہے وہ حقیقتاً دینِ مصطفوی ہی کی شاعرانہ تعبیر و تفسیر ہے۔ خودی کی تربیت و تکمیل کے لئے جب وہ آئینِ فطرت کی پابندی کی تلقین کرتے ہیں تو ان کی مراد خلاقِ محمدی اور اسوۂ رسول ﷺ کی پابندی و پیروی سے ہی ہوتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست
زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تویست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اولا یزل است و قدیم
از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیر و ثبات

غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰ ﷺ
گل شواز بادِ بہارِ مصطفیٰ ﷺ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت
بہرۂ از خلقِ اوبیاد گرفت
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است
درجہاں دست و زباش رحمت است

اقبال کے کلام میں رسالت یا نعت کا موضوع کس حد تک دخیل ہے۔ ان اشعار کی روشنی میں اس کا جواب کچھ مشکل نہیں رہ جاتا۔ اس دخل کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کی شاعری رسمی انداز کی نعتیہ شاعری نہیں رہی بلکہ ذات و صفاتِ محمدی کے بیان کے ساتھ ساتھ دین مصطفیٰ کے اساسی پہلوؤں کی بھی مظہر بن گئی ہے ان پہلوؤں کی تشریح و توضیح میں اکثر جگہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق و سیرت کا ذکر آیا ہے اور اقبال کی طبع عاشقانہ اور مزاجِ شاعرانہ نے ہر جگہ اس ذکر میں خاص قسم کا لطف و کیف سمو دیا ہے چنانچہ اس ذکر میں اقبال کے یہاں بہت سے اشعار بہت سے ٹکڑے اور بہت سے قطعات مل جاتے ہیں جو اقبال کو ایک بلند پایہ نعت گو ثابت کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان پہلوؤں کے ذکر و اذکار میں اقبال نے اُردو سے زیادہ فارسی سے کام لیا ہے یعنی ان کے نعتیہ اشعار زیادہ تر فارسی ہی میں ہیں۔ جرمن شاعر گوئٹے کی مشہور نظم (نغمۂ محمدی) کا آزاد ترجمہ بھی اقبال نے فارسی میں کیا ہے۔ یہ نظم پیامِ مشرق میں جوئے آب کے نام

سے شامل ہے۔ چار شعروں کے چار بند ہیں اور اسلامی تخیل و تصورِ خیال کے حقیقی ترجمان ہیں صرف دو بند بطور نمونہ دیکھئے۔

در راهِ او بهار پری خانه آفرید
نرگس دمید و لاله دمید و سمن دمید
گل عشوه داد و گفت یکے پیشِ ما بایست
خندید غنچه و سرِ دامانِ او کشید
ناآشنائے جلوه فروشانِ سبز پوش
صحرا برید و سینه کوه و کمر درید
زی بحر بیکرانه چه مستانه می رود
در خودیگانه از همه بیگانه می رود
دریائے پر خروش زبند و شکن گذشت
ازتنگنائے وادی و که و دمن گذشت
یکساں چو سیل کرده نشیب و فراز را
از کاخ شاه و باده دکشت و چمن گذشت
بیتاب تند تیز و جگر سوز و بیقرار
در هرزمان بتازه رسیداز کهن گذشت
زی بحرِ پیکرانه چه مستانه می رود
در خودیگانه ازهمه بیگانه می رود

گوئٹے کی یہ نظم جس میں اس نے اسلامی تخیل کو نہایت خوبصورت پیرائے میں جگہ دی ہے دراصل اس کے ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی لیکن اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ اقبال نے المانی شاعر کے نازک و لطیف خیالات کو حد درجہ شگفتہ و سادہ فارسی میں منتقل کر کے غیر معمولی کمال شاعرانہ کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ''رموزِ بے خودی'' کے آخر میں بھی ایک نہایت خوبصورت نعتیہ ٹکڑا ملتا ہے۔

اے ظهور تو شباب زندگی
جلوه ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاهت ارجمند
آسماں از بوسه بامت بلند
شش جهت روشن زتاب روئے تو
ترک و تاجیک و عرب هندے تو
از تو بالا پایه ایں کائنات
فقر تو سرمایه ایں کائنات
در جهاں شمعِ حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی
بے تو از نابود مندیها خجل
پیکرانِ ایں سرائے آب و گل

تا دمِ تو آتشے از گلِ کشود
تو وہ ہائے خاک را آدم نمود
ذرہ دامن گیر مہر و ماہ شد
یعنی از نیروئے خویش آگاہ شد
تا مرا افتاد بر رویت نظر
از اب دام گشتۂ محبوب تر

ان اشعار کے بعد اقبال نے اپنے اضطراب عشق اور ملتِ اسلامیہ کی بدحالی کا ذکر بڑے دردمند لہجے میں کیا ہے۔ آخری شعروں میں بطور مناجات حضور اکرم ﷺ سے امتِ محمدی پر نگاہ خاص کی دعا مانگی ہے۔

''جاوید نامہ'' میں جا بجا بڑے دلکش اور معنی خیز نعتیہ اشعار نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں فلکِ مشتری پر حلاج و غالب اور قراۃ العین طاہرہ و زندہ رود کے مکالمات کی صورت میں اقبال نے جو کچھ کہا ہے خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔

زندہ رود نے نظامِ حیات کی کشمکش کے بارے میں سوال کیا تھا

صد جہاں پیدا دریں نیلی فضاست
ہر جہاں را اولیا و انبیاست

اقبال نے غالب کی زبان میں جواب دیا۔

نیک بنگر اندریں بود و نبود
پہ بے پہ آید جہانہا در وجود

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمت اللعالمینے ہم بود

زندہ رود نے اس نکتے کو فاش تر الفاظ میں بیان کرنے کی گذارش کی تو جواب میں غالب نے کہا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمت اللعالمینی انتہا است

زندہ رود نے اسی قسم کا سوال حلاج سے کیا۔ اقبال نے حلاج کی طرف سے جواب میں کہا۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفےٰ اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

زندہ رود نے مزید وضاحت کے لئے سوال کیا۔

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطاست
سرِّ آں جوہر کہ ناش مصطفےٰ است
آدمے یا جوہرے اندر وجود
آنکہ آید گاہے گاہے در وجود

اس کے جواب میں علامہ اقبال نے حلاج کی زبان سے جو کچھ کہلوایا

ہے توحید و رسالت کے ایک نہایت نازک اور اہم پہلو کو زیرِ بحث لے آتا ہے۔

اس میں اقبال نے عبد و معبود کے رشتے سے حضور اکرم ﷺ کی ذات و صفات کا بیان جس حسن کاری کے ساتھ کیا ہے وہ نعتیہ شاعری کی تاریخ میں آپ اپنی مثال بن گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا معبود سے کیا اور کس نوعیت کا رشتہ ہے اس سلسلے کے چند اشعار دیکھتے چلیے۔

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہ فرمودہ است
عبدہ از فہمِ تو بالا تر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہر او نے عرب نے اعجم است
آدم است و ہم ز آدم اقدم است
عبدہ صورت گر تقدیر ہا
اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہ ہم جانفزا ہم جانستاں
عبدہ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبد دیگر عبدہ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہ دہر است و دہر از عبدہ ست
ماہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست

عبدہ با ابتدا بے انتہا ست
عبدہ از صبح و شامِ ما کجاست
کس ز سرِ عبدہ آگاہ نیست
عبدہ جز سرِّ الا اللہ نیست
لا الہ تیغ و دمِ او عبدہ
فاش تر خواہی بگو ہو عبدہ
عبدہ چند و چگونِ کائنات
عبدہ رازِ درونِ کائنات

''ارمغانِ حجاز'' کے بعض قطعات بھی اقبال کی نعتیہ شاعری کے بہترین اجزاء میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ ایک قطعہ تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے محبت اور خوف کے باب میں کچھ اس انداز سے کہہ دیا ہے کہ صاحبِ دل مسلمان کو اندر سے پگھلا کر رکھ دیتا ہے۔ آپ نے یہ قطعہ ضرور سنا ہو گا۔

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ مارا
حساب من ز چشمِ او نہاں گیر

اقبال کی اُردو شاعری کی بھی یہی صورت ہے یعنی اساسی طور پر ان کا

سارا کلام توحید و رسالت کے پاکیزہ تصورات و حکیمانہ نکات کا مظہر ہے لیکن رسمی انداز کی نعتیہ نظمیں یا غزلیں ان کے یہاں نہیں ملتیں۔ ہاں مختلف نظموں میں درجنوں ایسے اشعار اور ٹکڑے مل جاتے ہیں جو اعلیٰ درجے کی نعتیہ شاعری کے زمرے میں آتے مثلاً سنائی کے مزار کے سلسلے کی نظم میں بعض ایسے اشعار ہیں جو حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کی محبت و عقیدت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ
عجب کیا گر مہ و پروین مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

بعض جگہ غزلوں میں بھی نعت کے بلند پایہ شعر مل جاتے ہیں۔ مثلاً بالِ جبریل کی ایک غزل میں ہے۔

خبر ملی ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور کئی مقامات ایسے ہیں جہاں اقبال نے حضورِ اکرم ﷺ کو مخاطب کر

کے اپنی بات کہی ہے اور اس انداز سے کہ نعت کے سوا ان کے اشعار کو اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا اس مخاطبے کی ایک مثال دیکھیے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقلِ غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب

علامہ سیماب اکبرآبادی
کی
نعت گوئی

بیسویں صدی کے نصف اول میں اُردو کے جن شعراء نے نام پایا اور جن کے انفرادی اسلوب نے مختلف اصنافِ سخن میں تازگی اور جدّت کی نئی روح پھونک دی ان میں سیمابؔ اکبرآبادی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ وہ اپنے ہم عمر اور ہمعصر شعراء میں کئی حیثیتوں سے ممتاز تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ کئی زبانوں پر مہارت رکھتے تھے اور قدیم اور جدید علوم کی آویزش سے زندگی اور ادب کے جو نئے مسائل پیدا ہوئے ان کا ادراک بھی انہیں حاصل تھا۔ نتیجتاً ان کی شاعری کا مجموعی رنگ ورُوپ اور لب ولہجہ لفظ ومعنی دونوں اعتبار سے روایتی شاعری سے بہت الگ ہوگیا۔ پھر اس رنگ ورُوپ، لب ولہجہ کو نکھارنے اور موثر بنانے کیلئے انہوں نے جس قسم کی مشق و ریاضت سے کام لیا اس نے اُن کی شاعری میں ایسی فنی بلندیاں پیدا کردیں جو انہیں کا حصّہ ہوکر رہ گئیں۔ نظم، غزل، رباعی اور مسدس مثنوی، ہر صنف میں انہوں نے اپنی اجتہادی شان برقرار رکھی اور ہر ایک میں ایسا نقش بناگئے کہ بیسویں صدی کے ادب پر محاکمہ کرتے وقت کوئی مؤرخ یا ناقد اُن کی تخلیقات کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔

زندگی اور ادب دونوں کے بارے میں اُن کا نقطہ نظر شروع سے لے

کر آخر عمر تک رجائی رہا۔ وہ مشکلات اور حادثات کے سامنے کبھی سپر انداختہ نہیں ہوئے۔ عزتِ نفس اور حمیّت ملّی کی قیمت پر کبھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ زندگی کی کٹھن سے کٹھن منزلوں میں بھی خود اعتمادی، خودنگری اور حوصلہ مندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اپنے زورِ بازو اور مشیتِ ایزدی کو انہوں نے زندگی کا راہنما جانا اور طریقت وشریعت دونوں کے حوالے سے انہوں نے اپنی زندگی کچھ ایسے سلیقے اور حُسنِ عمل کے ساتھ گزاری کہ اپنے تو اپنے غیر بھی ان کے افکار وخیالات کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے، ان کے مندرجہ ذیل چار مصرعے جن میں سیمابؔ کی شخصیت، سیرت اور شاعری کا عطر کھنچ آیا ہے، اکثر کو یاد ہیں اور میں نے بہتوں سے انہیں سنا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض کو تو یہ نہیں معلوم کہ یہ حیات افروز اشعار سیمابؔ کے ہیں:

سجدے کروں، سوال کروں، التجا کروں
یوں دیں تو کائنات مرے کام کی نہیں

وہ خود عطا کریں تو جہنم بھی ہے بہشت
مانگی ہوئی نجات مرے کام کی نہیں

یہ مصرعے سیمابؔ کے مزاج اور کردار کے حقیقی ترجمان ہیں۔ انہوں نے دریوزہ گری کو کبھی شعارِ حیات نہیں بنایا۔ خودشناسی اور خودنگری کے ساتھ جئے اور اسی عالم میں وفات پائی پھر یہ بھی نہیں کہ انہوں نے ذاتی اغراض ومفادات

کی خاطر ملّی وقومی مقاصد کو قربان کیا ہو۔ برعظیم کی تحریکِ آزادی میں سینکڑوں علماء و دانشور، ادیب اور شاعر مصلحتوں کا شکار ہوئے۔ اور مطالبہ پاکستان کے وقت ملّتِ اسلامیہ کے دشمنوں کے حلیف بن گئے۔ سیمابؔ اکبرآبادی نے یہ نہیں کیا۔ انہوں نے ایک سچے، باشعور اور خوددار مسلمان کی حیثیت سے علامہ اقبالؔ، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرتؔ موہانی اور علامہ سلیمان ندوی کی پیروی کی اور تحریکِ پاکستان کو طاقتور بنانے میں بالاعلان حصّہ لیا۔ افسوس کہ ان کی دینی وملّی خدمات کو ہم بھلاتے جا رہے ہیں۔ ورنہ حق یہ ہے کہ نہ صرف شاعر وادیب بلکہ تحریکِ آزادی کے مجاہدوں میں بھی وہ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اور ان کا یہی ذوقِ آزادی تھا کہ وہ ہزار دُشواریوں کے باوجود جلد سے جلد پاکستان آگئے اور یہیں کراچی میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

سیمابؔ کی زندگی کی ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ علوم جدیدہ سے واقفیت اور شعر و ادب میں جدّت پسندی کے باوجود وہ کبھی مشرقی اقدار و روایات سے گریز کرنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ علوم وفنون میں مغرب کی بعض بالادستیوں کا انہیں ہمیشہ اعتراف رہا ہے۔ لیکن وہ احساسِ کمتری میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے بجلی کے قمقموں کے مقابلے میں گھر کے چراغوں کو کبھی بے وقعت نہیں گردانا اور جدید کی خاطر قدیم کو یکسر ڈھا دینے کا خیال ان کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے رشتوں کو خوب سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ جس کا ماضی نہیں اس کا حال بھی نہیں اور جس کا حال نہیں اس کا کوئی مستقبل

نہیں، یہی وہ شعور تھا جس نے سیمابؔ کو زندگی کے عصری میلانات سے بھی ہمکنار رکھا اور عظمتِ رفتہ سے بھی غافل نہ رہنے دیا۔ چنانچہ ان کے یہاں جدید غزل اور جدید نظم کے ساتھ ساتھ ان اصنافِ سخن سے بھی گہرا لگاؤ پایا جاتا ہے جنہیں خالص مشرقی کہا جاتا ہے اور جن کے موضوعات کو ہمارے عہد کے بعض شعراء و ناقدین بزعم خود فرسودہ و بے جان خیال کرتے ہیں، حالانکہ ان اصناف کا تعلق زندگی کی ایسی بنیادی قدروں سے ہے جن پر عظمتِ انسانی کو ہمیشہ ناز رہا ہے اور رہے گا، میری مراد حمد و نعت اور منقبت کی صنفوں سے ہے جنہیں سیمابؔ اکبرآبادی نے ایک ہمہ گیر اور باشعور شاعر کی حیثیت سے اپنایا اور اعلیٰ درجہ کی شاعری کا جزو بنا دیا۔

سیمابؔ نے نعت گوئی پر بطورِ خاص توجہ دی، ان کی یہ توجہ بعض دوسرے نعت گو شعراء کی طرح نہ تو رسمی تھی اور نہ اس بناء پر تھی کہ انہیں اس بہانے بزمِ شعراء میں باریابی حاصل ہو جائے گی، اور ان کو لوگ جاننے پہچاننے لگیں گے، ان کے علم و فضل اور فکر و فن کی بدولت انہیں یہ چیزیں اوائل شعر گوئی ہی سے میسر آگئی تھیں اور بہت جلد ان کا شمار صفِ اوّل کے شعراء میں ہونے لگا تھا۔ نعت گوئی کی طرف ان کی توجہ کا خاص سبب یہ تھا کہ ان کا طبعی میلان ہی دین کی طرف تھا، انہیں مشرقیت، مشرقی اقدار اور دینی موضوعات سے شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے، اور انہوں نے زندگی کے مسائل پر غور کرتے وقت ہمیشہ مشرقی اندازِ نظر ہی کو معیار بنایا ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے شریعت کی پابندیوں

کے ساتھ طریقت کو بھی اپنا مسلک بنایا۔ وارثی سلسلے میں بیعت ہوئے۔ مکمل قرآن پاک کا منظوم اُردو ترجمہ کیا۔ مولانا روم کی مثنوی کو اُردو نظم کا جامعہ پہنایا، قومی و ملی نظمیں اور نعتیں کہیں لیکن اس وقت صرف ان کا مجموعہ نعت ''سازِ حجاز'' میرے پیشِ نظر ہے۔ اس میں انہوں نے ایک سچے موحد کی حیثیت سے مقامِ محمدی ﷺ کو جس حُسنِ احتیاط اور منصبِ رسالت کی عظمت کو جس کمالِ فن کے ساتھ محصور کرلیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعت گوئی کے سلسلے میں انہوں نے پھونک کر قدم رکھا ہے۔ لغزشِ زبان و لغزشِ خیال کا کہیں شکار نہیں ہوئے۔ وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر رسالت کو توحید کی حدود میں نہیں لے گئے اور کسی صحابی یا بزرگ سے عقیدت رکھنے کے سبب نعت کو منقبت یا مدح کے ہم رتبہ نہیں جانا۔ حفظِ مراتب کا لحاظ ہر جگہ رہا ہے، غالباً اس لئے کہ عرفیؔ کی طرح وہ بھی خوب جانتے تھے کہ نعت گوئی کا راستہ بال سے زیادہ باریک تلوار کی دھار سے زیادہ تیز اور شعر گوئی کے سلسلے میں بہت خطرناک ہے۔

عرفیؔ شتاب، ایں رہِ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ، بروم تیغ است قدم را
ہُشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہہِ کونین ﷺ مدیحِ کے و جسم را

سیماب کی عام اُردو شاعری کی طرح ان کی نعتیہ شاعری بھی اپنے عہد کی عام روش سے بہت الگ ہے۔ ہمارے ہاں نعتوں اور نعت گو شعراء کی کمی

نہیں ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے دو چار نعتیں نہ کہی ہوں، آج کل تو یہ شوق عام ہے، ہر سال نعت کے درجنوں مجموعے آجاتے ہیں اور خوبصورت سے خوبصورت چھاپے جاتے ہیں۔ لیکن ان پر فکر و فن کے زاویئے سے نظر ڈالئے تو اندازہ ہو گا کہ یہ معنوی حیثیت سے ایک جیسے ہیں، عام طور پر نعت کیلئے وہی پُرانی ہیئت استعمال ہو رہی ہے۔ یعنی زیادہ تر غزل کی شکل میں نعتیں کہی جاتی ہیں۔ طویل نعت ہو تو اسے قصیدے کا نام بھی دے سکتے ہیں اس لئے کہ غزل اور قصیدہ کی ہیئت ایک ہی ہے۔ پُرانی ہیئتوں میں شعر کہنے میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر کو اظہارِ خیال کیلئے ایک بنا بنایا سانچا مل جاتا ہے اور اس سانچے میں پُرانی ترکیبیں، تشبیہیں، علامتیں اور تلمیحات بڑی آسانی سے جگہ پاتی ہیں، شعر آسانی سے موزوں ہو جاتا ہے اور چونکہ عوام الناس ان سانچوں کے رنگ و رُوپ سے مانوس ہوتے ہیں اس لئے بقدرِ ظرف ان سے لُطف اندوز ہونے یا اُن کے مفہوم تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ ایسی نعتیں مشاعروں کیلئے، سیرت کے عام جلسوں کیلئے، میلاد شریف کی محفلوں کیلئے، ابلاغ عامہ کے اداروں کیلئے اور قوالی کے اجتماعات کیلئے بہت موزوں ہوتی ہیں شوق سے سُنی اور سُنائی جاتی ہیں۔ اور نعت کے ساتھ نعت گو شاعروں کی شہرت کو بھی دُور دُور تک پہنچا دیتی ہیں۔ لیکن فکر و فن کے اعتبار سے ان نعتوں کا رتبہ زیادہ بلند نہیں ہوتا، جدّت اور انفرادیت بھی ان میں نظر نہیں آتی، اس لئے موضوع سے قطع نظر جب صرف اعلیٰ درجے کی شاعری زیرِ بحث آتی ہے تو عام طور پر

نعتوں کا یہ ذخیرہ خود بخود نظر انداز ہو جاتا ہے۔

سیماب اکبر آبادی کی نعتوں کی یہ کیفیت نہیں ہے، ان کی نعتیہ شاعری مولانا حالی، مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال کی نعتیہ شاعری سے مماثل اور نعت گو شعراء کی عام ڈگر سے بہت مختلف ہے۔ سیماب نے نعت کے سلسلے میں صرف حضورِ اکرم ﷺ کے زلف ولب ورخسار یا عام صفات و معجزات ہی کو سب کچھ نہیں جانا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر آنحضرت ﷺ کے اصل پیغام کی غایت، اثرات، کردار کی خصوصیات، سیرت اور سیرت کے سماجی و معاشرتی مؤثرات اور انسان کی تمدنی زندگی میں ان کے افادات کو پیشِ نظر رکھا ہے چنانچہ سیماب کی نعتیہ شاعری کا رشتہ اپنے عہد کی ملّی و قومی زندگی سے اسی طرح اُستوار ہے جس طرح ان کی عام غزلوں اور نظموں کا۔ سیماب کی نعتیہ شاعری میں حضور اکرم ﷺ کی سیرت و کردار کو وقت کے تقاضوں اور زمانے کی ضرورتوں کے مطابق اس طرح ڈھالا گیا ہے کہ ایک طرف ان کی نعتیہ شاعری عصری میلانات کی آئینہ دار بن گئی ہے دوسری طرف بڑے دل آویز پیرائے میں انہوں نے زندگی کو صلح و آشتی اور دل جوئی و دل نوازی کا درس دیا ہے۔ گویا سیماب کی نعتیہ شاعری اپنے ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے اُردو کی عام نعتیہ شاعری سے بہت مختلف ہے۔ نعتیہ شاعری سے انہوں نے تادیبِ نفس اور اصلاحِ معاشرہ کا وہی کام لینا چاہا ہے تو نعت گوئی کا اصل مقصود تھا اور جس کی بناء پر حضور اکرم ﷺ نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ اور حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالی عنہ وغیرہ کو نعت

گوئی کی اجازت دی تھی اور شاعری کو فلاحِ انسانی سے منسلک کر کے اس کیلئے جواز پیدا کیا تھا۔ بعد کے نعت گو شعراء نے مقصودِ اصلی کو نظر انداز کر کے صرف حضورِ اکرم ﷺ کے جسدِ مبارک اور اُن کی ظاہری صفات ہی پر ساری توجہ مرکوز کر دی۔ سیماب نے ایک عالم، ایک دینی مفکّر اور ایک بالغ نظر شاعر کی حیثیت سے اس بے اعتدالی کو محسوس کیا اور نعت کو حضور ﷺ کے ظاہری اوصاف سے زیادہ باطنی اور عملی صفات و محاسن کا ترجمان بنایا، مختلف ہیّت اور مختصر اور طویل نظمیں کہیں اور اُن کی معرفت بِرعظیم کی ملّتِ اسلامیہ کی زندگی میں ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ یہ اُن کا ایسا امتیاز تھا جو اُردو کی نعتیہ شاعری میں ان کے نام کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے اور نعت گوئی کا ایک نیا راستہ دکھاتا ہے۔

سیماب کا دوسرا وصف جو ان کی تمام نعتوں میں یکساں نظر آتا ہے۔ وہ اُن کا شاعرانہ اسلوب یا موضوع کے ساتھ ان کا فنی برتاؤ ہے۔ سیماب کو معلوم ہے کہ نعت گوئی کا موضوع بذاتِ خود بڑا عظیم ہے اور اس عظمت کو نعت میں اسی وقت برقرار رکھا جا سکتا ہے جب کہ اس کے شایانِ شان مؤثر اور دلکش اسلوب اختیار کیا جائے، مانا کہ شاعری میں یہ بات بہت اہم ہے کہ کیا کہا گیا ہے لیکن یہ بھی کم اہم نہیں کہ بات کیسے کہی گئی ہے بلکہ خالص فنی نقطہ نظر سے دوسری بات کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہے اور اسی لئے سیماب نے اپنی نعتوں کیلئے حد درجہ دلآویز اور متغزلانہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔ انہوں نے نعت میں نئی نئی ترکیبوں، تازہ تشبیہوں اور جاندار استعاروں سے وہی کام لیا جو ایک بڑا شاعر اپنی شاعری میں

لیتا ہے۔ ان کی حمد یہ اور نعتیہ شاعری میں وہی ایمائیت و رمزیت وہی ایجاز و اختصار ہے جسے کسی فن پارے کی ضمانت کہا جاسکتا ہے۔ تخّیل اور فکر کی وہی ندرتیں ہیں جو شاعری میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرتی ہیں۔ خیال اور حُسنِ خیال کی وہی بوقلمونیاں ہیں جن کی معرفت شاعری دلکش اور نظر گیر بن جاتی ہے، زبان و بیان کی وہی نادر کاریاں ہیں جو شاعری میں حیرت زائی کی کیفیتیں پیدا کرتی ہیں غرض کہ سیمابؔ کی نعتیہ شاعری، لفظ و معنی، ہر اعتبار سے ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ لفظی پیکر کے لحاظ سے اس کا رُخ افقی یعنی نظم کی جملہ ہیئتوں پر محیط ہے اور معنوی لحاظ سے عمودی ہے یعنی اس میں عمق و بلندی بھی ہے تہہ داری بھی۔ اس جگہ وضاحت سے لکھنے کی گنجائش نہیں صرف چند اشعار بطورِ مثال دیکھئے، ان میں بعض اشعار حمد سے متعلق ہیں بعض نعت سے بعض مناجات سے اور بعض کا تعلق حمد و نعت و مناجات کی ملی جلی کیفیات سے ہے لیکن سب کے سب اشعار تغزل و شعریت سے لبریز ہیں، شاعر کے دل سے نکلے ہیں اور قاری کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔

عروسِ فطرت! مری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے، جمالِ زیرِ نقاب تیرا
مری رسائی سے دُور ہے تو، مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں اُلٹ دیا تھا نقاب تیرا

نہ حُسن پَرتو سے تیرے خالی، نہ بے اثر آب و رنگ تجھ سے
تمام کافر جوانیوں پر برس رہا ہے شباب تیرا

انساں کی نظر کو وہ اعجاز عطا فرما
اس دورِ پُرافسوں میں جو کام عصا کا دے

تجدیدِ سر شکِ غم تاچند سرِ دامن
طولانی صحرا دے، پہنائی دریا دے

پھر نام ترا لے کر دل سوختہ اُٹھ بیٹھیں
خاکسترِ سوزاں پر تسنیم کا چھینٹا دے

وہ سجدہ کیا! رہے احساس جس میں سر اُٹھانے کا
عبادت اور بقیدِ ہوش، توہینِ عبادت ہے

میں تو کچھ بھی نہیں سیمابؔ مگر بات ہے یہ
بات میری مرے سرکار ﷺ بنا لیتے ہیں

اس قسم کے نہ جانے کتنے اشعار اور طویل نظموں کے نہ جانے کتنے ٹکڑے ہیں جن کے مطالعے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ سیمابؔ اکبرآبادی کا اپنی نعتیہ شاعری کے بارے میں یہ دعویٰ:

میں اے سیماب طوطیِ گلستانِ محمدﷺ ہوں
کہ ہے میرے نفس سے نزہتِ خُلد بریں پیدا

محض شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ ایک واضح حقیقت ہے۔

محشرِ رسول نگری

کی

مُسدّس فخرِ کونین پر ایک نظر

''فخرِ کونین'' اُردو کی پہلی طویل نظم ہے جس میں آنحضرتﷺ کی سیرت و زندگی کو شعر کا قالب دیا گیا ہے۔ یہ نظم موضوع کی عظمت اور بیان کی دلکشی کے اعتبار سے کیا کچھ اپنے اندر رکھتی ہے، اور اس میں قارئین کی نشاطِ رُوح و تصفیہء قلب کا کیا کیا سامان موجود ہے، اس کا پورا اندازہ تو کتاب کے مطالعہ کے بعد ہوگا۔ اس جگہ صرف اس قدر کہنا ہے کہ ہمارے یہاں بدقسمتی سے ایسی نظموں کو کچھ زیادہ لائقِ پذیرائی خیال نہیں کیا جاتا۔ اوّل تو ان نظموں کو مذہب تاریخ اور اخلاقیات کا منظوم درس خیال کر کے ہمارے ناقدین ان پر نظر ڈالنا ہی پسند نہیں کرتے اور اگر تنگ نظری و بے دلی کے ساتھ کوئی ناقد اس طرف متوجہ ہوا تو وہ ایسی نظموں کو صحافت سے قریب تر موضوعاتی شاعری کا جزو کہہ کر انہیں بے سبب کم مایہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

موضوعاتی یا غیر موضوعاتی شاعری سے کیا مراد ہے۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں اجمالاً یوں کہہ سکتے ہیں کہ موضوعاتی شاعری بہ حیثیت مجموعی خارجی واقعات سے اور غیر موضوعاتی شاعری داخلی کوائف سے تعلق رکھتی ہے۔ غیر موضوعاتی شاعری میں ہم اس کے نفسِ مضمون کا ادراک آسانی سے نہیں کر

پاتے۔ ہم نہیں جانتے کہ جو نظم ہم سُننے والے ہیں اس میں کیا کچھ کہا جائے گا، اور کس نقطۂ نظر سے کہا جائے گا، یوں سمجھ لیجئے کہ غیر موضوعاتی شاعری عالمِ محسوسات و کیفیات کی ترجمان ہونے کے سبب اپنے قاری یا سامع کو قبل از وقت موضوع و مواد کا سراغ نہیں دیتی، سننے والا جو کچھ سنتا ہے یکا یک سنتا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے بروقت محسوس کرتا ہے۔

اس کے برعکس موضوعاتی شاعری جس کی نمائندگی، مراثی، قصائد، منظوم افسانے اور تاریخی نظمیں کرتی ہیں۔ خارجی واقعات کا ایک مخصوص پس منظر رکھتی ہے۔ یہ پس منظر کبھی کُلّی تو کبھی جزوی طور پر عنوان کے ساتھ ہی سامع یا قاری کے ذہن میں اُبھر آتا ہے، گویا موضوعاتی شاعری ہمیں اس بات کا پہلے ہی پتہ دے دیتی ہے کہ اس میں کیا کچھ بیان کیا جانے والا ہے۔ نفسِ مضمون کے اس پیشگی وقوف کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ہم اس قسم کی شاعری کے موضوع کو کبھی کبھی پامال محسوس کرنے لگتے ہیں اور اندازِ بیان کے سوا کوئی چیز ہمیں متاثر نہیں کرتی، علاوہ ازیں چونکہ اِس قسم کی شاعری کا اصل محور کوئی خارجی واقعہ ہوتا ہے جس کا حلقہ اثر عموماً کسی خاص علاقہ وطبقہ یا ملت وقوم تک محدود ہوتا ہے اس لئے ایسی نظموں کا دائرہ اثر کچھ زیادہ وسیع نہیں ہوتا۔

میرے خیال میں موضوعاتی شاعری کے متعلق ناقدین کی یہ رائیں سوچی سمجھی نہیں ہیں دُنیا کے شِعری کارناموں کو ذہن میں اُبھاریئے تو اندازہ ہوگا کہ اُن میں سے اکثر موضوعاتی شاعری سے تعلق رکھتے ہیں۔ کالیداس کے

منظوم ڈرامے، ہومر کی الیڈ و اوڈیسی، ویاس کی مہابھارت، تلسی داس کی رامائن، فردوسی کا شاہنامہ، نظامی کا خمسہ، ورجل کی اینڈ، ملٹن کی فردوسِ گمشدہ، ڈانٹے کی طربیہ ربانی اور گوئٹے کی فاؤسٹ سب موضوعاتی شاعری کے ذیل میں آتی ہیں، لیکن کیا محض اس بناء پر کوئی شخص ان نظموں کو کم مرتبہ خیال کرے گا؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر اس نوع کی دُوسری نظموں سے بے اعتنائی مُناسب نہ ہوگی۔ انیس کا مرثیہ ہو یا حالی کا مسدس ''سحر البیان'' ہو یا ''زہرِ عشق''، ''چراغِ کعبہ ہو'' یا ''ابرِ کرم''، شبلی، اقبال کی تاریخی نظمیں ہوں یا امیر و محسن کے نعتیہ قصائد، ہمارے دور میں حفیظ کا شاہنامہ ہو یا ماہر القادری کی نظم ''ظہورِ قدسی'' اور محشر رسول نگری کی ''فخرِ کونین'' ان میں سے کسی ایک کو بھی موضوعاتی شاعری کی بناء پر نظر انداز کرنا نا انصافی ہوگی۔

کسی نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ شاعری کے لئے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ شعر میں ڈھلنے کے لئے بیتاب ہے ضرورت صرف ایک ایسے دیدہ ور کی ہے جو انہیں شعر کا قالب عطا کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں موضوعات کے انتخاب کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ موضوع کے بے جان جسم میں رُوح دوڑانے کا۔ یہ رُوح خارجیت میں بھی کہیں کہیں چھپی ہوتی ہے۔ لیکن جو چیز اس کو پُوری رجائی قوت کے ساتھ بروئے کار لاتی ہے، وہ دراصل شاعری کی فنّی صلاحیت و شخصیت ہے۔ مثلاً تلسی داس کی رامائن کو لے لیجئے، بقول فراق گورکھ پُوری رام اور سیتا کی کہانی بھی کوئی کہانی ہے، اس

سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز کہانیاں آے دن کہی اور سُنی جاتی ہیں۔ لیکن جب تلسی داس جیسا جادُو نگار شاعر اسے چھو لیتا ہے تو یہی کہانی مقبولِ خلائق بن جاتی ہے۔ اور اس میں عظمت کے ایسے آثار پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس کا شمار دنیا کی بہترین نظموں میں ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح آرتھر اور رولان، پریام وہلن، منیشرہ و افراسیاب، سکندر و دارا، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، سسّی پنّوں، بے نظیر و بدر منیر اور بکاؤلی و تاج الملوک کی داستانیں بذاتِ خود کسی حیثیت سے غیر معمولی نہیں ہیں۔ اُن سے بہتر افسانے، عظیم تر واقعات اور اہم تر موضوعات ہمیں اس کائنات میں نظر آتے ہیں لیکن فنکاروں کی بدولت جو شہرت و قبولیت ان افسانوں کو میسر آئی ہے وہ دوسرے واقعات کو نصیب نہ ہو سکی۔

ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ شعری تخلیق میں موضوع بذاتِ خود اتنا اہم نہیں جتنا کہ موضوع کو برتنے کا سلیقہ جسے اسلوب کا نام دے سکتے ہیں اور جو فنکار کی تخلیقی نُدرت و فنی مہارت کے سہارے صورت پذیر ہوتا ہے کسی تخلیق کو ادنیٰ و اعلیٰ، وقتی و دائمی یا صحافتی و ادبی بناتا ہے۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ موضوعات و واقعات یکسر غیر اہم ہوتے ہیں یقیناً بعض موضوعات اہم بعض کم اہم اور بعض اہم تر ہوتے ہیں، صرف یہ کہ شاعری میں اُن کی اہمیت کا انحصار دلکش فنی اسلوب پر ہوتا ہے کبھی اہم تر موضوعات شعر میں دخیل ہو کر غیر اہم اور کبھی معمولی موضوعات فنی سحر کاریوں سے اہم ترین بن جاتے ہیں۔ یہ کیونکر

ہوتا ہے، اس کا جواب چنداں مشکل نہیں ہے۔ فنکار کی خوش ذوقی، فنی مہارت، بالغ نظری، جمالیاتی احساس و اِدراک، روایات کا پاس، مشاہدات و تجربات کا تنوع اور قادر الکلامی اور ندرتِ خیال و فکر، ایسی چیزیں ہیں جو عموماً کسی موضوع کو اہم بنانے میں معاونت کرتی ہیں، لیکن اس سلسلے میں جو چیز اہم ترین خیال کیئے جانے کے لائق ہوتی ہے وہ شاعر کی جذباتی صداقت ہے، جذباتی صداقت سے مُراد، فنکار کا اپنے موضوع سے وہ گہرا لگاؤ، عقیدہ و اخلاص ہے جو اسے کسی موضوع کو شعر کا قالب دینے پر مجبور کرتا ہے۔ کوئی فنکار جب اس "جبرِ اندرُوں" کے ساتھ کچھ کہتا ہے تو موضوع ذہن سے گذر کر دل میں اس طرح اُتر جاتا ہے، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اب اس اخلاصِ شدید یا جبر اندرُوں کو غالبؔ کے لفظوں میں دل گداختہ کہہ لیجئے، یا اقبال کی زبان میں خُونِ جگر، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر نہ موضوع کی اہمیت محسوس ہوتی ہے اور نہ فن کی عظمت۔ گویا کہنے والا جب تک خُود اپنے جذبے، اپنے تجربے اور اپنے موضوع سے متاثر نہ ہو وہ اپنے کلام سے دُوسروں کو متاثر نہیں کر سکتا۔

چنانچہ فلسفیانہ مضامین کو شعر کا موضوع بنایا جائے یا اخلاق و مذہب کو، عُلُومِ معاشرتی کو زیرِ بحث لایا جائے یا تاریخی و نیم تاریخی واقعات کو قدیم داستانوں اور تمدنی روایات کو نظم کیا جائے یا موجودہ سیاسی و سماجی مسائل کو اشتراکیت و استعماریت پر طبع آزمائی کی جائے یا سرمایہ داری و جمہوریت پر، ضرورت اس امر کی ہے کہ جو کچھ کہا جائے اسے عقل و ذہن کی سطح سے اتار کر احساس و جذبہ کی

گہرائیوں میں ڈبولیا جائے ورنہ ان کا رسمی بیان قادر الکلامی اور فنی مہارت کے باوجود شعر میں تاثیر پیدا نہ کر سکے گا۔

دنیا کے شعری کارناموں کو ذہن میں اُبھاریئے تو اندازہ ہوگا کہ موضوع سے گہری ذہنی وابستگی اور جذباتی لگاؤ کی بدولت بہت سے ایسے مذہبی و ملّی موضوعات میں آفاقی وابدی شاعری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں جنہیں آج ہم اپنی کم فہمی اور کوتاہ نظری سے طبقاتی ہنگامی اور مذہبی خیال کرتے ہیں اور شعر کا موضوع بناتے ہوئے شرماتے ہیں۔ مثلاً فردوسِ گمشدہ میں کھل کر عیسائیت کی تبلیغ کی گئی ہے۔ ''اینڈ'' میں روما کی برتری کا راگ الاپا گیا ہے، ''شاہنامہ'' میں قدیم ایرانی شہنشائیت کو اسلام کی جمہوری تحریک سے عظیم تر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''سکندر نامے'' میں قبلِ مسیح کے ایک غیر مُسلم یونانی فاتح کے کارناموں کو سراہا گیا ہے۔ ''رامائن'' میں بھگتی تحریک کو تقویت پہنچائی گئی ہے۔ ہمارے دور میں علامہ اقبالؔ نے کھل کر اسلام اور اس کی برکات کو شعر کا موضوع بنایا ہے، لیکن کس میں ہمت ہے کہ ان کی شاعرانہ عظمت و کمال سے انکار کرے، بات یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ جذبِ اندرُوں سے مجبور ہو کر کہا ہے۔ قلب و روح کی گہرائیوں کے ساتھ کہا ہے۔ اُن کے یہاں نظریہ کی تبلیغ کی نوعیت محض فلسفیانہ اور منطقی نہیں بلکہ تخئیلی اور جذباتی ہے اُن کا بیان واعظانہ اور خطیبانہ نہیں، شاعرانہ و فنکارانہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا مذہب کسی مُلا کا مذہب نہیں رہا، بلکہ دنیا کے سارے صاحبانِ ذوق کی طمانیت و رُوح خیزی کا سبب بن

گیا ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اخلاقیات، تاریخی واقعات سوانح و سیرت اور اسلامی تعلیمات و پیغامات کو شعر کا موضوع بناتے ہوئے لوگ جھجکتے ہیں کتراتے ہیں اور بعض تو انہیں شعر وسخن کے لئے مُہمل قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں مذہب کا نام لینا تنگ نظری ہے اس کے پیغام کو عام کرنا رجعت پسندی اور آنحضرت ﷺ کی سیرت و سوانح کو شعر کا موضوع بنانا غیر شاعرانہ مشغلے ہیں اور ان کو وُہی شعراء اپناتے ہیں جو شاعر کم اور مذہبی مبلغ زیادہ ہوتے ہیں، اُن کا یہ بھی یقین ہے کہ اس قسم کی شاعری چونکہ مخصوص عقائد و نظریات سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اس میں عوام کی دلکشی و دلچسپی کا سامان نہیں ہوتا۔ ایسی شاعری صرف مسلمانوں کو مذہبی عقائد کے سہارے متاثر کرتی ہے۔ اور دُوسرے اس میں اپنے لطف و انبساط کا کوئی سامان نہیں پاتے۔ شاید اسی غلط فہمی کا اثر ہے کہ مولانا شبلیؒ علامہ اقبالؔ، محسنؔ کاکوروی، امیر مینائیؔ اور انیسویں صدی کے اِکا دُکا شاعروں کے علاوہ کسی نے بھی اسلام اور اس کے عالمگیر پیغام کو شعر میں راہ دینا پسند نہیں کیا، اس کے برعکس طویل خیالی افسانوں، جیمناتی داستانوں اور غیر زبانوں کی بعض مذہبی تاریخی اور نیم تاریخی نظموں کو اُردو کا جامہ پہنانے کی پُوری کوشش کی گئی ہے۔ آپ یُوسن کر حیرت ہوگی کہ ملٹنؔ کی ''فردوسِ گمشدہ'' کالیداس کی شکنتلا وکمار سنبھو، فردوسی کا شاہنامہ، نظامیؔ کا خمسہ وسکندر نامہ، عطار کی منطق الطیر، مولانا رُوم کی مثنوی معنوی، سب رس، باغ و بہار، فسانہ عجائب

اور داستان امیر حمزہ وغیرہ کو ایک بار نہیں کئی کئی بار اُردو میں منظوم کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ نقشِ اوّل سے نقشِ دوم کسی ایک جگہ بھی بہتر ثابت نہیں ہوا۔ چنانچہ آج بہت کم لوگ ہیں جو ان شاعروں کے نام سے بھی واقف ہوں۔

لیکن اس سے یہ خیال نہ کریں کہ اُردو کے یہ شعراء، شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک نہ تھے۔ ان میں شاعرانہ صلاحیتیں بھی تھیں لیکن تقلیدی رُجحان اور ترجمہ میں مکھی پر مکھی بٹھانے کی کوشش نے ان کے یہاں وہ انفرادیت نہ پیدا ہونے دی جو شاعر کے قبولِ عام کا سبب بنتی ہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنی زمینیں آپ پیدا کیں اور اپنے موضوعات آپ انتخاب کئے، انہیں ان کی فنی صلاحیت، موضوع کی محدودیت کے باوجود ایک ایسے مقام پر لے گئی جہاں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ''اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں''۔ مگر اُردو میں انیسؔ، دبیرؔ، مونسؔ، ضمیرؔ، نفیسؔ، مُحسنؔ کاکوروی، امیرؔ مینائی، شبلی نعمانیؔ، اور علّامہ اقبال کے نام اس سلسلہ میں بآسانی لئے جاسکتے ہیں، بعدازاں حفیظؔ جالندھری اور منظور حسین منظورؔ نے تاریخ اسلام کو ''شاہنامہ'' اور ''جنگ نامہءاسلام'' کے نام سے نظم کیا، ہرچند کہ ''شاہنامہ'' کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہیں نظامِ اسلامی اور رُوحِ اسلامی سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتا، پھر بھی ان کے مصنّفین نے اپنی ایک شاعرانہ حیثیت بہرحال منوالی ہے۔ لیکن انسانی زندگی کا ایک وسیع موضوع جس پر تاریخِ اسلام اور اسلام دونوں کی اصل روایات وخصوصیات کا

مدار ہے، اور جس نے خلائقِ عالم کو، امن وآشتی اور کیف ونشاط کا پیغام سنایا، اب تک ہمارے شعراء کی نظروں سے اوجھل تھا، یوں آنحضرت ﷺ کی مدحت وتوصیف میں اچھے نعتیہ قصائد اور نظمیں تو کہی گئی ہیں، لیکن حضور ﷺ کی پوری زندگی اور سیرت کو تاریخی صحت کے ساتھ نظم کرنے کا خیال کسی کو نہیں آیا۔ آخر کار محشرؔ رُسول نگری کی نظر اس اہم ترین موضوع پر پڑی اور انہوں نے ''فخرِ کونین'' کے نام سے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے جلو میں اس طرح لے لیا کہ انہیں کا ہو کر رہ گیا۔

''فخرِ کونین'' کا پہلا حصّہ جس میں آنحضرت ﷺ کی پیدائش سے لے کر ہجرت تک کے کارناموں کا ذکر ہے اور دوسرے حصّے میں سفرِ مدینہ سے لے کر فتحِ مکہ تک کا بیان ہے اور بیانِ حُسن وحُسنِ بیان دونوں لحاظ سے اُردو کی شاعری میں خاص اہمیت رکھتا ہے، پوری نظم مسدّس کی شکل میں ہے۔ مسدّس دراصل مسمّط کی ایک صورت ہے جس میں چھ چھ مصرعوں کے بند ہوتے ہیں۔ پہلے چار مصرعے ہم وزن وہم قافیہ اور آخری دو مصرے متفق الوزن ومختلف القافیہ ہوتے ہیں۔ ہر بند اپنی جگہ ایک جزو بھی ہوتا ہے اور کُل بھی۔ جزو کی حیثیت سے وہ نظم کو معنوی وحدت، واقعاتی تسلسل اور تخیلی بوقلمونی کے ذریعہ ایک ناقابلِ تقسیم اکائی بنا دیتا ہے، اور کل کی حیثیت سے وہ کسی بھی جزوی خیال یا واقعہ کو چھ مصرعوں میں سمو کر مختصر ترین نظم کا لطف دیتا ہے۔ گویا خواجہ میر دردؔ کے لفظوں میں مسدّس کا ہر بند ہمیں یہ سمجھاتا ہے کہ

هر جزو کو کُل کے ساتھ بہ معنی ہے اتصال!

دریا ہے دُرِ جدا ہے پہ ہے غرقِ آب میں

حقیقتاً ایک مسدّس نما نظم، کسی شاعر سے صفتِ ایجاز واطناب دونوں کو بہ یک وقت شاعرانہ سلیقہ سے برتنے کا تقاضا کرتی ہے یہ سلیقہ اللہ کی توفیق کے بغیر محض اکتساب سے نہیں آتا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم لکھتے ہیں کہ ''ہماری شاعری میں مسدّس نظم کی ایک ایسی قسم ہے جس کا نبھانا آسان نہیں ہے، اچھے اچھے شاعر بھی ناکام رہ جاتے ہیں اور بھرتی کے مصرعوں سے چُول بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں''۔ شاید اسی دقت کے سبب اُردو فارسی کے شعراء نے مسدّس کی موضوعی وسعت کے باوجود اسے کچھ زیادہ ہاتھ نہیں لگایا۔ چنانچہ اُردو شاعری کی تاریخ میں مدّ و جزر اسلام (۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) سے قبل کوئی قابلِ ذکر مسدّس نما نظم نہیں ملتی۔ مدّ و جزر اسلام اُردو کا پہلا طویل ترین مسدّس ہے جو سرسیّد کی فرمائش پر منظر پر عام آیا۔ اس مسدس کی روش، موضوع ہیئت اور زبان و بیان تینوں اعتبار سے انیسویں صدی سے یکسر مختلف تھی۔ اس لئے اس کی مقبولیت کے امکانات کچھ زیادہ روشن نہ تھے خود حالی کو یہ خدشہ تھا کہ ہمارے ملک کے اہلِ مذاق ظاہراً اس رُوکھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے کیونکہ اس میں تاریخی واقعات چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ جو آج کل قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ نہ مبالغہ کی چاٹ ہے اور کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی ہے۔ نہ تکلف کی چاشنی ہے، غرض کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ولا اُذن سمعت ولا

فطرة علی قلب بشر۔ گویا اہلِ دہلی اور لکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چُنا گیا ہے جس میں اُبالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے باوجود حالی کے دردمند شاعرانہ لب ولہجہ نے اسے اس حد تک قبول عام بخشا کہ اُردو میں مسدّس کہہ کر مسدّس حالی مُراد لینے لگے۔

حالی سے پہلے مدّ و جزر اسلام جیسی طویل نظم تو مسدّس کی صورت میں کسی کے یہاں نہیں ملتی، ہاں انیس و دبیر نے واقعات کربلا کے سلسلے میں اس سے پہلے مسدّس کو ضرور برتا تھا۔ لیکن اوّل تو یہ واقعات ''نمک مرچ''، ''رنگین بیانی''، ''نازک خیالی''، مبالغہ کی چاٹ، اور تکلف کی چاشنی سے خالی نہیں۔ دُوسرے یہ کہ انہوں نے جس چیز کو رواج وفروغ دیا وہ مسدّس نہیں ''مرثیہ'' ہے۔ اس لئے مسدّس کی ہمہ گیری اور صنفی حیثیت کا احساس اُردو شعراء کو دراصل ''مسدّس حالی'' کے بعد ہوا ہے۔ حالی کے زیر اثر اقبال نے ہمالہ، تصویر درد، شمع و شاعر، خضرِ راہ، طلوع اسلام، شکوہ جوابِ شکوہ، جیسی عمدہ نظمیں اُردو شاعری کو دیں اور مسدّس کو اُردو شعراء کی توجہ کا مرکز بنا گئے۔ اس توجہ کے نشانات آپ کو اکثر جگہ ملیں گے۔ لیکن اس سلسلے میں جسے ''نشانِ منزل'' اور ''منزل'' دونوں کا نام دے سکتے ہیں۔ وہ اقبال ہی کے مکتبہ فکر کے ایک خوش فکر شاعر محشر رُسول نگری کی طویل نظم ''فخرِ کونین'' ہے۔

''فخرِ کونین'' جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اُردو میں ''مدّ و جزر اسلام'' کے بعد دوسری طویل نظم ہے جو مسدّس میں لکھی گئی ہے اور اس کامیابی کے ساتھ

لکھی گئی ہے گویا اس کے موضوع کے لئے مسدّس سے بہتر شعری ہیئت ممکن ہی نہ تھی۔ علامہ سید سُلیمان ندوی مرحوم مسدّس کی صنفی حیثیت سے متعلق لکھتے ہیں۔ ''مسدّس'' کی یہ صورت ہے کہ اس کا ایک بند گویا کتاب کا ایک مختصر باب یا تحریر کا ایک پیراگراف ہوتا ہے جس میں ایک ایک واقعہ الگ الگ ادا ہوتا ہے نظم کی رفتار پہلے مصرعے میں تمہید، دُوسرے، تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں واقعہ کی تفصیل اور پانچویں اور چھٹے میں نتیجہ کی تاثیر بنتی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کہاں سے چیز شروع ہوئی کہاں تک اُوپر چڑھی اور پھر کہاں سے نیچے اُتری۔ ہر نئے بند کے شروع اور خاتمہ پر سامع کا نفس تبدیلِ ذائقہ اور تجدیدِ احساس کے لئے مستعد اور تیار رہتا ہے۔ ''مسدّس فخرِ کونین'، مسدّس کی اس تعریف و معیار پر پورا اُترتا ہے۔

اس کے دونوں حصّوں میں کوئی گیارہ بارہ سو بند یا تین ساڑھے تین ہزار اشعار ہوں گے لیکن یہ سب بہ اعتبار معنی و فن ایک دُوسرے سے ایسے مربُوط ہیں کہ روانی و تسلسل میں کہیں کوئی فرق نہیں آیا۔ صحتِ واقعات اور تاریخی ربط کے لحاظ سے اسے ''منظوم سیرت النبیؐ'' کا نام دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ہر واقعہ اور ہر خیال کے سلسلے میں شاعر نے قرآن و حدیث اور سیَر و تواریخ کے مستند ماخذات سے استفادہ کیا ہے۔ شاعرانہ قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ آیاتِ قرانی احادیثِ نبوی اور اقوالِ صحابہء کرام کے بعض عربی فقرے تلمیحاً اس خوبصورتی سے نظم میں داخل ہوگئے ہیں گویا ان کا تعلق عربی سے نہیں اُردو کے روزمرّہ سے

ہے۔ اسی کے ساتھ نظم کو سجانے اور موثر بنانے کیلئے الفاظ کی سحر کاریوں انور تخییل کی گلریزیوں سے بھی کام لیا گیا ہے، اور اس طرح کے نفسِ مضمون کی صحت و نزاکت کہیں مجروح نہیں ہونے پاتی۔ یہ آخری منزل کس درجہ مشکل تھی اور اس مشکل سے ''فخرِ کونین'' کا شاعر کن چیزوں کے سہارے کامیاب و آسان گزر گیا اس کا کم و بیش اندازہ آخری صفحات کے ان اشعار سے ہوسکتا ہے۔

باطل کا راہِ صدق و صفا میں گذر کہاں
نا اہل کو مقامِ نبیؐ کی خبر کہاں
اخلاص کے بغیر سخن میں اثر کہاں
ہو دل ہی بے بصر تو مذاقِ نظر کہاں
درکار ہے کمالِ صفا اس مقام پر
ہے جنبشِ نظر بھی خطا اس مقام پر

نظروں سے چومتا ہوں مدینے کے بام و در
کرتا ہوں پھر ثنائے شہنشاہ بحر و بر
دُشوار ہے یہ مرحلہء نعت کس قدر
میں چل رہا ہوں تیغ برہنہ کی دھار پر
سَرمست ہوں اگرچہ فروغِ نشاط سے
رکھتا ہوں ایک ایک قدم احتیاط سے

یقین ہے کہ موضوع سے مخلصانہ لگاؤ کی یہ سرمستی اور اسے برتنے کی یہ احتیاط ایک طرف اہلِ ذوق اور اہلِ دل کی تسکین ورُوح خیزی کا سامان فراہم کرے گی دوسری طرف ''فخرِ کونین'' کے شاعر کو دنیا و آخرت دونوں میں سرخرو رکھے گی۔

امین راحت چغتائی

کا نعتیہ کلام

محرابِ توحید

چند روز پہلے کی بات ہے امین راحت چغتائی کے تازہ ترین مجموعہ کلام ''بام اندیشہ'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا

''حضرت امین راحت چغتائی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ کئی دہائیوں سے شعر کہہ رہے ہیں اور اُستادی کے منصب پر فائز ہیں جملہ اصنافِ سخن اور اوزانِ شعری پر اُن کی مکمل دسترس ہے۔ مشقِ سخن کی لمبی مسافت کے باوجود وہ ابھی تھکے نہیں ہیں، تازہ دَمی کے ساتھ قدیم و جدید میلاناتِ حیات کو مرکزِ سخن بنائے ہوئے ہیں اور نئی نسل کے شعراء کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہیں۔

امین راحت چغتائی کا نیا شعری مجموعہ ''بام اندیشہ'' اس وقت بشکل مسوّدہ میرے سامنے ہے اور میں اُس پر نظر ڈالنے کے بعد میرؔ کے لفظوں میں یہ کہنے مجبور ہوں کہ

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

کلاسکیت کا جورچاؤ، تقریباً دوسو صفحات کے اس مجموعے

میں مجھے نظر آیا، اُس پر حیرت نہیں کہ شاعر کی پختگی فکر و فن کا یہی تقاضا تھا، مجھے حیرانی اس بات پر ہے کہ اُردو شاعری کے جدید سے جدید میلانات، اُن کے کلام میں سموئے ہوئے ہیں اور اس دلنشیں پیرائے میں کہ ہم امین راحت چغتائی کو آج کی شاعری کا نمائندہ شاعر کہہ سکتے ہیں۔ کیا خوب اور کیا سچ کہا ہے کہ

ڈبوتا ہے جو ساحل پر سفینے
وہی راحتؔ اب اپنا ناخدا ہے

یہ بیان ابھی میرے ذہن میں تازہ ہی تھا کہ ''محرابِ توحید'' کے عنوان سے امین راحت چغتائی کی نعتیہ شاعری کا مجموعہ میرے سامنے آ گیا اور مجھے اس کے محاسن کے زیرِ اثر اعترافاً صرف اس قدر کہنا ہے کہ پختگی فکر و فن کی جو روشنی اُن کے مجموعۂ کلام میں نظر آتی ہے وہ امین راحت چغتائی کے نعتیہ مجموعے محرابِ توحید میں کئی گناہ زائد ہو چکی ہے اور بدرِ نبوت کی چاندنی، انسانی فکر و نظر کی حدِ آخر تک پھیلی ہوئی ہے، حرف حرف روشن، لفظ لفظ منور اور ایک ایک شعر و مصرعہ شاعری کی پیشانی کا جھومر بنا ہوا ہے ''محرابِ توحید'' میں نعتیہ نظمیں بھی ہیں اور نعتیہ غزلیں بھی اور دونوں حُسنِ خیال و حسنِ عمل کی یکجائی کے حوالے سے ایسی شیر و شکر ہو گی کہ معنوی اعتبار سے انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مناسب نہ ہوگا۔

موضوعاتی عظمت اور معنوی قدر و قیمت سے قطع نظر ظاہری صورت میں بھی ''محرابِ توحید'' ہر طرح نظر گیر ہے، کمپوزنگ و طباعت سرورق کی زیبائش و آرائش، کاغذ کی دبازت اور جلد سازی کی حُسن کاری و پرکاری خوب سے خوب تر کے ذیل میں آتی ہے اور اُردو نعتیہ کتب کے ذخیرے میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایک نعت نذر کرتا ہوں

وہ آقا نورِ ایمان و یقین ہے
کہ سیرت جس کی قرآنِ مبیں ہے

کماں کے فاصلے کو کون سمجھے
شبِ معراج وہ اتنا قریں ہے

یہاں محتاج سب لطف و کرم کے
یہاں چھوٹا، بڑا، کوئی نہیں ہے

درودوں کی صدائیں، دل سے اُٹھیں
مرا آقا مرے کتنا قریں ہے

ابھی جلوے نہ پوچھو جالیوں کے
ابھی تو ہوش ہی آیا نہیں ہے

کبھی اُنؐ کو، کبھی مہتاب دیکھا
کہا دل نے، مرا آقاؐ حسیں ہے

محمدؐ نام ہی دلکش بہت ہے
اِسے جس طرح بھی دیکھو، حسیں ہے

درِ اقدس پہ یوں محسوس کرنا
کہ راحتؔ بھی کہیں بیٹھا یہیں ہے

عبدالعزیز خالد
کی نعتیہ شاعری پر
ایک نظر

عبدالعزیز خالد نے ایک جگہ اپنے بارے میں لکھا ہے کہ

شریکِ بزم زہیر و ہمام بن غالب
ندیم غالبؔ و اقبالؔ و شمسؔ تبریزی

ان کا یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں، جن لوگوں کی نظر سے ان کے کلام کے دو چار مجموعے بھی گزرے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کر دیں گے کہ ان کے یہاں فکرِ اسلامی کو ہر جگہ مشعلِ راہ بنائے رکھنے کی کوشش اور فنی اظہار و ابلاغ میں مروجہ اسالیب سے بچ کر چلنے کی روش دو ایسی چیزیں ہیں جو فی الواقع ان کے کلام کے مطالعہ کے وقت قاری کو غالبؔ اور اقبالؔ کی یاد دلاتی ہیں۔ غالب کا ذکر آ گیا ہے تو ان کے متعلق مولانا حالیؔ کی چند سطریں دیکھتے چلیے۔ یادگارِ غالب میں شاعری پر بحث کرتے ہوئے ایک بڑے پتے کی بات کہہ گئے ہیں، لکھتے ہیں:

مرزا کی ابتدائی شاعری کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اردو کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی اوریجنلٹی اور غیر معمولی اپچ کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی

اوران کی غیر معمولی قابلیت واستعداد پر شہادت دیتی ہیں۔

معمولی قابلیت واستعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلّہ چلا جاتا ہے اُسی پر آنکھ بند کر گلے کے پیچھے پیچھے ہولیں اور لپک کر اِدھر اُدھر نظر اُٹھا کر نہ دیکھیں، جو ہُنر یا پیشہ اختیار کریں اُس میں اگلوں کی چال ڈھال سے سرِ موتجاوز نہ کریں اوران کے نقشِ قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں اوریجنلٹی (Originality) اور غیر معمولی اپچ کا مادہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر ان کو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنون کو چلتا ہوا دیکھتے ہیں اس پر چلنے سے ان کی طبیعت اِبا کرتی ہے یہ ممکن ہے جو طریقِ غیر مسلوک وہ اختیار کریں۔ وہ منزلِ مقصود تک پہونچانے والا نہ ہو مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کے طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چُور نہ ہو جائیں عام راہ گیروں کی طرح آنکھ بند کر کے شارع پر پڑ جائیں''۔

عبدالعزیز کی خالدؔ کی روشِ سخن گوئی پر بھی یہ بات صادق آتی ہے ان

کے ہاں بھی اسلوب و موادونوں میں ابداع واختراع کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ملتی ہیں، ان چالوں کے سبب وہ اُردو شاعری کی مروجہ ڈگر اور لب ولہجہ سے بہت الگ ہو گئے ہیں۔ اتنا الگ کہ بعض کے نزدیک وہ اجنبی ہیں، بعض کے نزدیک محض لفّاظ، بعض کی نظر میں مشکل پسند اور بعض کے لئے مہمل گو یہ الگ بات ہے کہ عبدالعزیز خالد نے اپنے قارئین وناقدین کو غالب کی طرح اس قسم کے طنز کا نشانہ نہیں بنایا۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو سُن کر جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ غالبؔ کی طرح عبدالعزیز خالدؔ نے بھی اپنے قارئین وناقدین کی آرا کا اثر قبول کیا ہے اس لئے کہ ان کے ابتدائی اور بعد کے کلام میں خاصی تبدیلی نظر آتی ہے اور پہلے کے مقابلے میں تازہ تر کلام میں ایک خوشگوار و دلنشین لب ولہجہ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بات میں ان کی دو تازہ تر تصنیفات ''منحمنا'' اور ''لحن صریر'' کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں اس لئے کہ اس وقت صرف یہی دو میری دسترس میں ہیں اور انہیں کی روشنی میں ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں کچھ عرض کروں گا

''منحمنا'' جیسا کہ خود عبدالعزیز خالد نے ہمیں بتادیا ہے کہ

''ہے یہ منِ جملہء اسمائے رسولِ مقبول ﷺ''

یعنی اس کتاب کا موضوع آنحضرت ﷺ کی شخصیت ہے جسے آپ اصطلاح شاعری میں نعتیہ قصیدہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ قصیدوں میں بھی فنی نقطہ نظر سے اسے قصیدہ میمیہ کا نام دیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ ''میم'' کی ردیف میں کہا گیا ہے۔ ذرا اس ''میم'' کو ذہن میں رکھ کر اس کے موضوع ''منحمنا'' یا ''محمدؐ'' پر غور کیجئے اور کتاب پر ایک نظر ڈالئے۔ صاف اندازہ ہوگا کہ موضوع یا مواد کو فنی صورت دینے میں شاعر نے کسی مصنوعی یا شعوری کوشش سے کام نہیں لیا بلکہ موضوع بالکل فطری انداز سے مناسب ترین ہیئت میں خود بخود ڈھل گیا ہے۔

''منحمنا'' کا موضوع حد درجہ عظیم بھی ہے اور حد درجہ نازک بھی۔ عظیم اس لئے کہ اگر آپ اور ہم اس کے اوصاف کے باب میں خاموش رہیں تو بھی اس کی عظمت میں فرق نہیں آتا اور اگر اپنی سمجھ میں سب کچھ کہہ دیں تو بھی کہنے کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ نازک اس لئے کہ اس کی سرحدیں حمد و منقبت کی سرحدوں سے ملی ہوئی ہیں اور کسی شاعر کا اس طرح بچ بچ کر چلنا کہ اس کا کوئی قدم اپنی حدود سے تجاوز کر کے دوسری سرحدوں میں نہ پڑنے پائے بہت مشکل ہے نعت گوئی کی یہی نزاکتیں اور دقتیں تو ہیں جن کے سبب اُردو میں اعلیٰ درجے کی نعتیہ شاعری کا سرمایہ کچھ زیادہ نہیں کہنے کو تو رسماً اس طرف اکثر شعراء نے توجہ کی ہے بلکہ شاید ہی اُردو کا کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے بارگاہ صمدیت اور بارگاہِ رسالت میں سجدہ شکرانہ کے طور پر اشعار نہ پیش کئے ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اشعار اس

دنیا میں اس کی سرخروئی کا سبب بھی بن گئے ہوں، لیکن جہاں تک دنیائے شعروسخن کا تعلق ہے اس میں چند ایک کے سوا کسی کو قبول عام کیا، قبول خاص بھی میسر نہیں آتا۔ ان میں آپ کو ناسخ لکھنوی اور سیماب اکبر آبادی جیسے شعراء بھی مل جائیں گے۔ جنہوں نے احادیث نبویؐ اور قرآن کریم کو نظم کا جامہ پہنا کر ثواب دارین حاصل کرنے کی کوشش کی اور دردؔ و اصغرؔ جیسے صوفی باصفا بھی مل جائیں گے جن کی زندگی کے اکثر لمحات وظائف و اوراد میں بسر ہوئے لیکن اُسے کیا کیجیے کہ امیر مینائی و محسن کاکوری کے ایک دو قصیدوں، ایک دو مثنویوں، مولانا حالیؔ کے مشہور مسدس کے بعض ٹکڑوں اور علامہ اقبال کے بعض اشعار و قطعات کے سوا کسی کا نعتیہ کلام صاحبانِ نقد و نظر کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا۔ ایسی صورت میں عبدالعزیز خالد کا ایک مشکل ترین صنفِ سخن کی طرف توجہ کرنا اور مسدس حالی کے طرز پر وقت کے تقاضوں کے مطابق ثنا و مناجات اور نوحہ قومی پر مشتمل نظم دے کر اس میدان میں اپنے لئے ایک ممتاز و نمایاں مقام بنا لینا ان کی غیر معمولی شاعرانہ فطانت کا ثبوت ہے۔

عبدالعزیز کا نعتیہ شاعری کی طرف توجہ دینا ایک اور سبب سے نہایت اہم خیال کئے جانے کے لائق ہے، آج کے لادینی عہد میں جبکہ مسلم معاشرہ سستی شہرت اور دولت کے جائز و ناجائز حصول کو سب کچھ سمجھتا ہے اور دین کی صالح اقدار اور روایات کو اپنی کج فہمی سے حصہ ماضی خیال کرتا ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ ایسے صاحبِ مطالعہ اور صاحبِ فکر حضرات ان اقدار و

روایات کی اشاعت وحفاظت کا ذمہ لیں جو اپنی خلاقانہ صلاحیتوں اور فنکارانہ سحرکاریوں کے ذریعے معاشرے کو بہ آسانی اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں، خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک ایسے ماحول میں جس میں اکثر حضرات. بہ زعم خود اسلامی قدروں یا مذہبی موضوعات کو ادب وشعر کا موضوع بنانا رجعت پسندی خیال کرتے ہیں۔ عبدالعزیز خالد نے اس طرف خصوصی توجہ کی اور ایک بالغ نظر مفکر وشاعر کی حیثیت سے اس راز کو بہت جلد پا گئے کہ شاعر کے لئے اس دنیا میں بذاتِ خود نہ کوئی موضوع فرسودہ ہے نہ تازہ بلکہ یہ شاعر کی ذات ہے جو فن کے جادو کے ذریعے فرسودہ کو تازہ اور تازہ کو فرسودہ بنا دیتی ہے۔

''قصیدہ'' جیسا کہ ان کے فن کا تقاضا ہے۔ شاعر موضوع یا ممدوح کے باب میں پُرجوش عقیدت اور زبان و بیان کے باب میں غیر معمولی قادر الکلامی کا مطالبہ کرتا ہے۔ ''منحمنا'' میں یہ دونوں باتیں نظر آتی ہیں شاعر کو موضوع سے گہرا لگاؤ ہے یعنی اس نے جو کچھ کہا ہے رسماً نہیں کہا بلکہ جذبِ اندروں کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہا ہے اس مجبوری نے پورے قصیدے کو جذباتی صداقت سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے۔ قلم، کرم اور دم کی زمین میں تقریباً ۱۵۰۰ اشعار کا قصیدہ کہنا ہی شاعر کی قادر الکلامی کی دلیل ہے، قصیدے کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک مصرعہ اس بات کی شہادت ہے کہ شاعر کا مطالعہ وسیع اور اُردو فارسی کے ساتھ عربی زبان پر بھی اس کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ عربی کے بعض الفاظ وفقرے تو اس

خوبی کے ساتھ اشعار میں درآئے ہیں، گویا وہ ایک مدت سے اُردو میں مستعمل ہیں اور ہماری زبان کا فطری جزو ہیں۔ چند شعروں میں ان کا مصرف دیکھئے۔

اگر بقا کا ہے ارمان تَعَاهَدُ الْقُرآن
کہ ہے یہ سیلِ فنا میں حصارِ مستحکم

لبوں پہ ہے یہی تسبیح لَا تُزِغْ قلبی
ہے دشتِ شوق میں ہر گام جان کا جوکھم

جہاں مظاہر و آثار پر لگاتا ہے حکم
دلوں کے حال سے ہے عزّ اسمہٗ اعلم

زباں نشرگہہ لا الٰہ حیر السّد
بدن ہوس کا نگارینہ بُت قدِ آدم

زروئے وحی ''جو'' ایہا المزمّل ہے
قیامِ شب سے رہے جس کی ساق و پا میں ورم

لیکن عبدالعزیز خالد کا فن اقبال کے انداز میں عربی کے بعض ٹکڑوں کو اُردو میں نگینہ کی طرح جڑنے تک محدود نہیں ہے۔ انہوں نے نظم میں موضوع کی رعایت اور قافیے کی بعض مجبوریوں سے یقیناً عربی الفاظ سے زیادہ کام لیا ہے لیکن ٹھیٹھ اُردو کے قوافی سے بھی وہ بے نیاز نہیں رہے بلکہ حق یہ ہے کہ جہاں

انہوں نے عقیدے کی معرفت اُردو کو عربی کے بہت سے نئے الفاظ دیئے ہیں وہاں محسن کاکوری کی طرح انہوں نے ہندی اور سنسکرت کے بعض الفاظ بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کئے ہیں صرف چند مثالیں دیکھئے۔

برا جماں ہوئے آکاش پر مکٹ دھاری
سلج سُباس سے چھلکائے پریم رس پریتم

یہ سب بھوی کا راجہ، مہا بلی، سمراٹ
اپار، آتھاہ، اننت اور وشواتم

ہے اَپسراؤں کے نازک لبوں پر کھیم کُسل
بنا دیا ہے مسرت نے سانس کو سرگم

حنائی انگلیوں کی ضرب و دلنشین دف پر
پڑے پھوار سی پھولوں پر جس طرح جھم جھم

کنوار چھل کی مہک، مورچھل جھلاتی ہے
ٹھسک سے چلتے ہوئے چھم چھماتے ہیں پری چھم

ملوک، رسمسے، سوشیل، سہج سیل سبھاؤ
رہیں بہار پہ جگ جگ جوانیاں جم جم

وہ شاہزادہ مکیاولی کے ہوں احکام
کہ ارتھ شاستر چانکیہ مُنی کے نیم

ہیں دونوں ہم قدح و ہم نور و ہم سوگند
ہے ان میں قدرتی سمبندھ من لگن، آپگم

ہیں وضع قطع سے جوگی، نیوگی اندر سے
کھنچا ہے قشقہ، لگا ہے تلک بنانا مم

غرض یہ کہ عبدالعزیز خالد نے منحمناؔ کے ذریعے ایک طرف اُردو شاعری کو ازسرِ نو ایک عظیم موضوع سے آشنا کیا ہے، دوسری طرف نئی نئی تلمیحات اور نئے عربی و ہندی الفاظ سے اُنہوں نے اُردو زبان کے دامن کو وسعت دی ہے۔

عبدالعزیز خالدؔ کی دوسری تازہ ترین تصنیف ''لحنِ صریر'' میرے سامنے ہے یہ رُباعیات کا مجموعہ ہے، رُباعی کو اُردو فارسی کی مختصر ترین نظم کہنا چاہیئے، اس لئے کہ اس میں صرف چار مصرعوں میں پوری بات کہنی پڑتی ہے ظاہر ہے کہ اس پابندی کے ساتھ موثر و دلکش پیرائے میں کچھ کہنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ جب غزل کے دو مصرعوں میں مکمل مضمون ادا کیا جاسکتا ہے اور اس کا اختصار کسی شاعر کی راہ میں حائل نہیں ہوتا تو چار مصرعے شعرگوئی میں کیونکر سدِّ راہ بن سکتے ہیں، یہ اعتراض درست ہے، لیکن رُباعی کے ساتھ کچھ اور پابندیاں بھی ہیں جو اُسے غزل سے بھی زیادہ مشکل بنا

دیتی ہیں۔ رباعی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے چار مصرے یا کم از کم تین مصرعے باہم مُقفّی ہوں۔ اس سے زیادہ یہ کہ دوسرے اصناف کی طرح رُباعی ہر ایک بحر اور ہر ایک زمین میں نہیں کہی جا سکتی اس کی بحر اور اس کا وزن مخصوص ہے یہ وزن قدیم ایرانی ترانے کے اوزان سے ماخوذ ہے اور قدیم ایرانی ترانے کی اساس موسیقی کے راگوں اور آواز کے لحنوں پر قائم ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شاعر قادر الکلام ہونے کے ساتھ لحن و بحر کا گہرا شعور نہ رکھتا ہو، رُباعی کا فن قابو میں نہیں آتا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ عبدالعزیز خالد میں یہ اوصاف موجود ہیں وہ ایک خلّاق شاعر ہونے کے ساتھ موسیقی کے لحنوں کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ متعدد زبانوں کے نبض شناس بھی ہیں اور ان زبانوں کی روایات و تلمیحات کے ذریعے اپنے کلام میں رنگ بھرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

لیکن "لحنِ صریر" کی اہمیت صرف زبان و بیان کے محاسن کے سبب نہیں ہے اس کے اور اسباب بھی ہیں یہ عبدالعزیز خالد کی دوسری تصانیف کے مقابلے میں یوں اہم تر ہو جاتی ہے کہ یہ ان کے جملہ افکار و خیالات اور ان کی سیرت و شخصیت کا مرقع ہے اس میں چھ سو سے زائد رُباعیاں ہیں اور چونکہ ہر رُباعی کسی موضوع یا خیال کی ترجمان ہونے کی حیثیت سے ایک مختصر و مکمل نظم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا چاہئے کہ ان کے سارے خیالات مشکل رُباعیات "لحنِ صریر" میں سمٹ آئے ہیں چنانچہ اگر آپ کو یہ معلوم کرنا ہو کہ عبدالعزیز خالد زندگی اور فن کے مسائل پر کس طرح غور کرتے ہیں، انہیں کس انداز سے دیکھتے ہیں، وقت کے

تقاضوں سے کس حد تک اور کس نہج سے متاثر ہوئے ہیں، سیاست و تہذیب، مذہب، اخلاقیات اور انسانیت کو پرکھنے کیلئے ان کے پاس کیا معیار ہیں؟ ان معیار کے پیچھے کون سا نقطۂ نظر کام کر رہا ہے؟ یہ نقطۂ نظر ان کا اپنا ہے یا دوسروں سے مستعار ہے؟ اس نقطۂ نظر کو انہوں نے اپنے فن میں کس طرح برتا ہے؟ اس طرح اور بہت سے سوالات ہیں جو کسی شاعر کی زندگی اور مطالعے کے وقت قاری کے ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ ان سب کے جواب لحنِ صریر میں ملتے ہیں گویا خالد اور ان کے کلام کو سمجھنے سمجھانے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ انتخابی نہیں رہتا بلکہ لازمی ہو جاتا ہے۔ ذیل کی چند رُباعیاں دیکھئے یہ مختلف خیالات کی حامل ہیں لیکن سب مل کر اکائی بناتی ہیں اس اکائی کا دوسرا نام عبدالعزیز خالد ہے

شاعر طبعاً درُون نگر ہوتا ہے
از سر تا پا قلب و نظر ہوتا ہے
رہتا ہے اپنے آپ میں گم لیکن
اخبارِ جہاں سے باخبر ہوتا ہے

زہر اب کو انگبیں بنا لیتا ہے
الحاد کو جزوِ دیں بنا لیتا ہے
ہے انفس و آفاق میں جو شے بھی اُسے
شاعر ملکِ یمیں بنا لیتا ہے

شاعر ہیں عزیزِ خاطرِ اہلِ دول
ہو گرم دماغ تو کھلے دل کا کنول
ہے جن کو مگر عزت و سادات عزیز
کرتے ہیں ''اِذَا فَرَغتَ فَانصَب'' پر عمل

شاعر نہیں جو مستِ مئے ذات نہیں
نقادِ روایات و درایات نہیں
رکھتا ہوں معانی سے سروکار فقط
میں قشر پرست اصطلاحات نہیں

فن اور فنکار

ہم رشقِ قلم کو بانگِ نے کہتے ہیں
خونابہء دل کو موجِ مے کہتے ہیں
لاشی کو مجسم و مصور کر کے
ہم صورت گر ''نہیں'' کو ''ہے'' کہتے ہیں

حقیقت شناسی

رم خوردۂ افکارِ مجرد ہیں حواس
ہو زخمہ زنِ سازِ تفکر احساس
سمجھو نہ اساطیر و قصص کو بیکار
تِلکَ الاَمثالُ نَضرِبُہا لِلنَّاس

رازِ حیات

اے ذرۂ بے مایہ و اے مہرِ مبین
تقسیم وظائف ہی سے چلتی ہے مشین
فضلنا بعضکم علی بعضٍ کی رمز
ہر راز کا ہوتا نہیں کوئی امین

وسعتِ نظر

اربابِ بصائر سے یہ پوشیدہ نہیں
میراث ہے بندگانِ صالح کی زمین
جو خادمِ انسان ہے اسی کو ہے بقا
چاہے کلمہ گو ہو وہ چاہے لادین

خانقاہ نشین

غافل شگرف کاری دوراں سے
تہذیبِ جدید کے سر و ساماں سے
اے منہمکِ کشف و شہود و اشراق
واقف نہیں تو حقیقتِ ایماں سے

صنائے حیات

خالد لبِ گویا ہے نہ گوشِ شنوا

بے نور ہوئی روشنیِ شہرِ نوا
انبوہ خلائق میں ہے گُم سُم شاعر
دل خستہ، جگر سوختہ، تنہا تنہا

خدا ترسی

ہے قلب و زباں دونوں پہ حق کی صدا
ناداں ہیں یہ دونوں ان کی بخشش فرما
اغفرلی عَمدی و خطئی یارب
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت سے بچا

خباثتِ باطن

میں صید زبوں خطوط نفسانی کے
غیروں سے ہیں بڑھ کے خبث باطن میں سگے
اے بارِ خدا خالدِ عاجز کو بچا
شیطاں کے کارندے کے ہتھکنڈوں سے

رموزِ حیات

الملک فی صغارکم، بدمستی
العلم فی رز الشکم پستی
الجرص علی المال تمنائے محال
الحرض علی العمر، فریب ہستی

ہوسِ دنیا

ابداعِ معانی ہے نہ حسنِ اسلوب
کر لی ہوسِ زر نے فطانت مسلوب
آزادیِ افکار کا خورشید ہوا
مغرب سے طلوع ہو کر مشرق میں غروب

ہے علم کی دولت سے تجارت مطلوب
لکھتے ہیں کتاب کی بجائے مکتوب
قرآن کو بیچتے ہیں اہلِ قرآن
کرتے ہیں مسیحا کو مسیحی مصلوب

چہ بوالعجبی

دیسِ اہلِ وطن کو درسِ حب الوطنی
در پردہ وطن کی جو کریں بیخ کنی
اخوانِ صفا کے محتسب اہلِ ریا
یہ پستی یہ بلندی اللہ غنی

آمریت

مامور من اللہ بنے، ہر آمر
ادراکِ مقامات بشر سے قاصر
افکار و خیالات کا گھونٹے وہ گلا
سچ کا کرے قتلِ علم مثلِ نادر

ان رُباعیوں کے عنوانات میں نے وسعتِ اظہار کے لئے خود قائم کئے۔ آپ چاہیں تو اسی انداز سے "لحن صریر" کی ہر رُباعی کو عنوان دے کر خالد کے فکر وفن کے خطوط کو بہ آسانی پڑھ سکتے ہیں۔

اُوپر میں نے خالد کے جن دو تخلیقی مجموعوں کا ذکر کیا ہے وہ اتفاق سے ہماری شاعری کی قدیم ترین اصناف یعنی قصیدہ اور رُباعی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن معنوی اعتبار سے دونوں مجموعے اپنے عہد کے تازہ میلانات اور وقت کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ گویا پیمانے پُرانے ہیں، شراب نئی ہے اور اس کا نشہ کم وبیش زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے۔

اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ خالد کی شاعری کی خوبیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اب خوگرِ مدح سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لیجئے۔ میں نے شروع ہی میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ خالدؔ کے تازہ تر کلام میں لب ولہجہ کی خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور اس تبدیلی نے ان کی مقبولیت کے امکانات پہلے کے مقابلہ میں روشن تر کر دیئے ہیں۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ ان کا اسلوب اب بھی اکثر جگہ ناہموار اور عربی سے گراں بار ہے۔ "لحن صریر" کی رباعیوں میں درجنوں ایسی ہیں جن میں مصرعے کے مصرعے اور بعض جگہ پورے پورے شعر عربی میں ہیں۔ عربی کے فقرے تو اس کتاب کی ہر دوسری رُباعی میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے خالد کی عربی دانی اور مختلف زبانوں پر ان کی دسترس کا سکہ تو قاری کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن اس سے ان کی شاعری کا

وہ حسن اکثر مقامات پر زائل ہو جاتا ہے جو روزمرّہ کی زبان کے فطری، برمحل اور پاکیزہ مصرف کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ الفاظ یا زبان وبیان کا ایسا فنی عمل جو کلام کی اثر آفرینی میں حائل ہو، مستحسن نہیں ہو سکتا۔ امید ہے خالد صاحب میری اس مخلصانہ رائے پر توجہ دیں گے اور اپنے اسلوب کو مزید خراد پر چڑھائیں گے۔ یہ دو سبب سے ضروری ہے اول اس لئے کہ پاک وہند سے عربی وفارسی کا ذوق رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور آثار ایسے ہیں کہ آئندہ ان کا ذوق رکھنے والے ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے، فارسی کو سمجھنے اور اس سے لطف لینے والے تو خیر اب بھی تھوڑے بہت لوگ موجود ہیں۔ لیکن عربی ادب کے مذاق سے تو ہمارا معاشرہ تقریباً ناآشنا ہے۔ عربی وفارسی سے عدم واقفیت اور ان کے ادبی مذاق سے ناآشنائی کی ساری ذمہ داری آج کے اُردو قاری پر اس لئے نہیں ڈالی جا سکتی کہ ہماری درسگاہوں سے ان کی تعلیم کا سلسلہ قریب قریب ختم ہو گیا ہے اور کہیں ہے بھی تو برائے نام، یعنی شعبے تو قائم ہیں، لیکن پڑھنے والوں کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اُردو کے عام یا خاص قاری سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عربی کے فقروں، کہاتوں اور عربی مصرعوں سے بوجھل اُردو زبان کی خاطر خواہ داد دے سکے گا غلط ہے۔ الفاظ بذاتِ خود اہم ہوں یا نہ ہوں لیکن کلام میں خیال کی نمائندگی وہی کرتے ہیں۔ اس لئے جب تک کوئی شخص الفاظ کے معنی اور معنی کے اندر چھپے ہوئے تلازموں کو نہ سمجھتا ہو وہ خیالات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ عربی آمیز اُردو کی ثقافت کا ایک ناخوشگوار اثر

خالد کی شاعری پر یہ ہوا ہے کہ ان کے یہاں خیال کے مقابلے میں زبان کی سطح زیادہ بلند ہو گئی ہے بلکہ کہیں کہیں تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر معمولی اور ادنیٰ خیالات کے لئے اعلیٰ درجہ کے پرشکوہ فقرے اور تراکیب ضائع کر رہا ہے اگر خالد کا کلام اقبال کی طرح کسی منظم فلسفہء حیات یا غالب کی طرح گہرے فلسفیانہ طرزِ کا حامل ہوتا تو وہ یقیناً زبان و بیان کی یہ شوکت وگراں باری عیب کی بجائے کلام کا حُسن بن جاتی۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ایسا نہیں ہے۔

خالد کی شاعری کی دوسری کمزوری اُن کی پُرگوئی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اب تک ان کے سترہ یا اٹھارہ مجموعہ ہائے کلام منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ممکن ہے کچھ مجموعے مسودات کی شکل میں بھی موجود ہوں ان کے معاصرین میں شائد ہی کوئی اور شاعر ہو جس نے اس کثرت سے شعر کہے ہوں اور کتابی صورت میں بھی شائع کر دیئے ہوں۔ اُردو شاعری کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس پُرگوئی نے بعض عظیم شاعروں کی شہرت و مقبولیت کو نقصان پہنچایا۔ آج کا دور تو خصوصاً ایسی عدیم الفرصتی اور بھاگ دوڑ کا دور ہے کہ اس میں کسی کو اتنا موقع ہی نہیں کہ وہ اشعار کے ایک بڑے ذخیرہ کی چھان بین کرے اور ہیروں کو خذف ریزوں سے الگ کر کے ان کی قدر و قیمت متعین کرے اور اگر کوئی سر پھرا ایک دو مقالات کے ذریعے ایسا کر بھی دے تو محض اتنی بات سے کسی کو مقبول عام بنانے کی راہیں نہیں کھل سکتیں، جب تک ادب کے قاری کو کسی کا کلام براہ راست پڑھنے کو نہ ملے اور وہ اپنے طور پر اس کے حسن و قبح کو محسوس نہ کر سکے، اس وقت

تک شاعر کی مقبولیت کے امکانات محدود ہی رہیں گے، دوسرے یہ کہ کسی شاعر کی عظمت کا تعلق مقدار یا پُرگوئی سے نہیں بلکہ معیار اور معیار کی نوعیت سے رہا ہے اس لئے معیار کو نظر انداز کر کے مقدار کو بڑھاتے رہنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ غالب نے بھی ابتدا یہی کیا تھا کہ چوبیس سال کی عمر تک صرف دس سال کی مشق سخن میں اُردو فارسی کے دو ضخیم دیوان الگ الگ بیدل کے رنگ میں تیار کر لئے تھے لیکن بعد کو انہوں نے اس میں سے صرف تھوڑا حصّہ قائم رکھا اور باقی کو قلم زد کر کے یہ اعلان کر دیا کہ اسے مجھ سے منسوب نہ کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی غالب جو اپنے معاصرین کے مقابلے میں انیسویں صدی عیسوی میں نامقبول و نامطبوع تھے، بیسویں صدی میں سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ ممدوح شاعر بن گئے، کیا اچھا ہو کہ غالب کی طرح خالد کو بھی کوئی مولوی فضل حق خیر آبادی جیسا صاحبِ ذوق اور مخلص دوست مل جائے اور خالد صاحب اپنے کلام کی اشاعت سے پہلے مسودے کو اس کے حوالہ کر دیا کریں۔

حضرت ستار وارثی
کی
نعتیہ شاعری

حضرت ستار وارثی کے نام اور کام کو کسی رسمی تعارف کی ضرورت نہیں۔ وہ برصغیر پاک و ہند کے ایک ایسے تاریخی شہر سے تعلق رکھتے ہیں جو سیف و قلم دونوں کیلئے ممتاز ہے۔ اس امتیاز کا تعلق کسی دنیاوی یا مادی منفعت سے نہیں بلکہ دین مبین کی حق و حمایت میں جذبہ ایثار و قربانی سے تعلق رکھتا ہے۔ میری مراد یو۔ پی کے مشہور شہر بریلی سے ہے۔ جس نے ملت اسلامیہ ہند کے بے شمار جاں نثاروں، عالموں، مجاہدوں، مورخوں، شاعروں اور ادیبوں کو جنم دیا۔ حضرت ستار وارثی کا آبائی تعلق اسی شہر سے ہے اور وہ بریلی کے قابلِ فخر سپوتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

حضرت ستار وارثی قولاً اور عملاً سچے عاشقِ رسول تھے اور تذکرۂ حبیب ﷺ ان کی زندگی کا وظیفہ خاص تھا۔ اس وظیفہ خاص کی نمود شعر کے پیکر میں ان کے مجموعہ ہائے کلام تخلیقات ''آیہ رحمت'' اور معطر معطر'' میں بھی ہو چکی ہے اور صاحبانِ ذوق سے خراج تحسین لے چکی ہے۔ اب ان کی فکر و نظر کا حاصل اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا عطر، ان کی تازہ ترین تصنیف ''حرفِ معتبر'' کی صورت میں منظر عام پر آیا ہے اور کچھ ایسی ندرتوں کے ساتھ آیا ہے کے ستار

وارثی کی قادر الکلامی اور شاعرانہ خلاقی، دونوں کی داد دینی پڑتی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ نعت گوئی کے فن کو سارے شاعروں، ادیبوں، عالموں اور ناقدوں نے مشکل ترین صنفِ سخن کہا ہے۔ اوّل اس لئے کہ حمد و نعت کی سرحدیں ایک دوسرے سے اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ شاعر کی معمولی سی معمولی لغزش بھی اسے نعت کی حدود سے بڑھ کی حمد کی حدود میں اور حمد کی سرحدوں سے نکال کر نعت کی سرحدوں میں داخل کر سکتی ہے اور اس طرح کا تجاوز کبھی مستحسن قرار نہ پائے گا۔

نعت گوئی کو مشکل ترین صنفِ سخن کہنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اس کا موضوع حد درجہ عظیم و وسیع ہے اور اس کے ذاتی و صفاتی مقامات و مراتب اتنے ارفع و اعلیٰ ہیں کہ اللہ رب العزت نے خود اس کی مدح فرمائی ہے اور اپنے بندوں کو اس کی مدح و ثناء کرنے کا حکم دیا ہے۔ ملائکہ تو اس ذاتِ اقدس پر صبح و شام درود و سلام بھیجتے ہیں۔

اب اس صورتِ حال میں حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی خود اپنے خالق و مالک کی ممدوح ٹھہرتی ہے ایسے ممدوح کے بارے میں کسی بندے کا کچھ عرض کرنا عجز کلام ہی کے طور پر ممکن ہے چنانچہ ہمارے شعراء نے عجز کلام کے اعتراف کے ساتھ ہی نعتیں کہی ہیں اور ''حرفِ معتبر'' کے خالق حضرت ستار وارثی، نعت گو شعراء کے اسی حلقے سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ ان کی نعتیں لفظ و معنی، دونوں کی سطح پر ادعائے مدح سے زیادہ، عشقِ رسول ﷺ میں ان کی

سرشاری و مستی، شیفتگی و وارفتگی اور گدازئ قلب و خود سپردگی کی مظہر ہیں۔

اُوپر نعت گو شعراء کے سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کی رحمتہ للعالمینی کے حضور عجز کلام اور اعتراف عجز کلام کا ذکر آیا ہے۔ اب اس عجزِ کلام کے باوصف نعت گوئی کے لئے ایسی ایسی راہیں نکالی ہیں اور ایسے ایسے پہلو تراشے ہیں کہ بارگاہِ رسالت کے احسان و فیضان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اپنے نعتیہ کلام ''حرفِ معتبر'' میں حضرت ستار وارثی نے نعت گوئی کے لئے ایک ایسی نادر راہ نکالی ہے کہ یہ راہ ایک طرف تو ان کی خلاقی و طباعی پر دلالت کرتی ہے اور دوسری طرف فکر و نظر کے خوبصورت زاویوں اور منفرد روزنوں سے عجیب و غریب روشنی بکھیرتی ہے۔

ان کے نعتیہ کلام میں التزام و اہتمام یہ کیا گیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے جملہ صفاتی اسمائے گرامی کو عنوان و موضوع بنا کر اشعار کہے گئے ہیں۔ یعنی ہر نام کے ساتھ ایک نعت معنون کر دی گئی ہے۔ یا یوں کہے لیجئے کہ ہر نام کے حضور ایک مکمل نعت بطور نذرانہ عقیدت و احترام پیش کی گئی ہے۔ یہ انداز پیش کش بھی اپنی ندرت رکھتا ہے اور ندرت یہ ہے کہ ہر نام کے معنوی رموز و نکات کی روشنی میں اشعار کہے گئے ہیں اور اس طرح ہر صفاتی نام کو پیکرِ نعت بنا دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک نعت دیکھئے:

اللہ کے حبیبؐ دو عالم کے تاجدار
لاکھوں سلام آپؐ پر اے شاہِ ذی وقار

وجہِ سکونِ قلب و نظر شانِ کردگار
ادراک و فہم و عقل و خرد تمؐ پہ سب نثار

افسانۂ جمالِ ازل، روئے تاب دار
حسنِ خدا ہے شانِ تبسم سے آشکار

میں کیفِ بے خودی میں بصد عجز و انکسار
سجدے کروں حضورؐ کی چوکھٹ پہ بار بار

ہو کشتگانِ عشق پہ رحمت کی اک نظر
ہے منتظر کرم کی ہر ایک چشمِ اشکبار

تم ہو میرے خیال میں اس طرح جلوہ گر
دشتِ جنوں نواز ہے اب رشکِ صد بہار

ہے یاوری پہ طالعِ ستارؔ غم نصیب
مشغولِ عرضِ حال ہے اب جانِ بے قرار

حضرت ستار وارثی کے کلام کا ایک بہت اہم اور منفرد پہلو یہ بھی ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے صفاتی کے سلسلے میں ہر اسم کی لغوی ومعنوی تشریح بھی، نعت کے اختتام پر دیدی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ کوئی خاص صفاتی نام حضور کو کس وقت، کس حوالے سے اور کس پس منظر میں عطا ہوا ہے۔ یعنی یہ تشریح بھی کر دی گئی ہے کہ کوئی خاص نام سب سے پہلے کس کتاب میں، کس شاعر کے یہاں یا کس راوی کے یہاں بیان ہوا ہے نیز اس کا ذکر اگر قرآن کریم میں آیا ہے تو کہاں کہاں آیا ہے۔ مثلاً جس جگہ محمد نام کے ساتھ نعت درج کی گئی ہے وہاں اس کے ذیل میں مستند حوالوں کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ محمد کا لفظ قرآن پاک میں صرف چار بار آیا ہے ورنہ پورے قرآن پاک میں اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کو دوسرے پیغمبروں کی طرح ذاتی نام سے نہیں بلکہ صفاتی نام سے پکارا ہے۔

مذکورہ بالا توضیحات کی روشنی میں حضرت ستار وارثی کے کلام پر نگاہ ڈالیے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کلام عام طرز کا کلام نہیں بلکہ اُردو کی نعتیہ شاعری کی تاریخ میں اس کا بالکل جداگانہ رنگ و آہنگ اور مقام ہے۔ یہ مجموعہ نعت سے آگے بڑھ کر نبی مکرم کے اسمائے گرامی کا مستند فرہنگ بھی ہے، حضور کے ناموں کی مفصل تاریخ بھی ہے، نام کے حوالے سے ان کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر بھی ہے اور اللہ و رسول کے ناموں کے درمیان فاصلہ و قربت کی پیمائش کے لئے ایک سنگِ میل بھی ہے۔

رہ گئے حضرت ستار کے نعتیہ شاعری کے محاسن، سو اس کا مختصر سا جواب

یہ ہے کہ نثر، خواہ کتنی ہی بامعنی اور خوبصورت کیوں نہ ہو، نظم یا شاعری کا جواب نہیں ہو سکتی چنانچہ کسی شعر کو خصوصاً نعتیہ شعر کو نثر کے پیکر میں لانا اسے بلند تر منصب سے فروتر لانا ہے شعر کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں جس نے یہ بھی سوال اُٹھایا تھا کہ

شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد

یعنی میرے شعر کو مدرسے کے درسی نصاب میں کس نے داخل کیا اور غیر ضروری نثری تفصیلات سے اسے بے رس اور بے رنگ کیوں بنایا؟ تو یہ سوال بے سبب نہیں اُٹھایا تھا جس طرح شعر گوئی کی قوت، فطرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے اسی طرح، شعر فہمی کی صلاحیت بھی من جانب اللہ تعالیٰ عطا ہوتی ہے اور یہ ہر صاحب ذوق اور خوش مذاق پڑھے لکھے آدمی کو عطا ہوتی ہے۔ اس لئے میں اُردو کے صاحبانِ ذوق سے حضرت ستار وارثی کے نعتیہ کلام پر اپنے طور پر نگاہ ڈالنے اور اس سے براہ راست لطف اندوز ہونے کی گذارش کروں گا۔

یہاں ایک نعت کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں

بہارِ عالمِ امکاں، محمدؐ ابنِ عبداللہ
سراپا رحمتِ یزداں، محمدؐ ابنِ عبداللہ

شہِ کونین، سلطانِ دوعالم، سیّدِ والا
قرارِ روحِ انس و جاں، محمدؐ ابنِ عبداللہ

زہے صلِّ علیٰ سرتا قدم تنویرِ خالق ہے
تمہارا پیکرِ تاباں، محمدؐ ابنِ عبداللہ

سراجِ بزمِ ایماں، چارۂ دردِ دل مضطر
ہو تم تسکینِ قلب و جاں، محمدؐ ابنِ عبداللہ

بنایا ربِ اکبر نے رسالت کا امیں تم کو
تمہی ہو جلوہ فاراں، محمدؐ ابنِ عبداللہ

تمہی ہو مونس و یاور تمہارا ورد ہے آقا
حریفِ گردشِ دوراں، محمدؐ ابنِ عبداللہ

نہیں افسردگیٔ بخت کا اب کوئی بھی شکوہ
مکیّف ہے دلِ حیراں، محمدؐ ابنِ عبداللہ

ہے ستارؔ حزیں مشغولِ تسبیحِ وفا ہر دم
ہو تم اللہ کا عرفاں، محمدؐ ابنِ عبداللہ

رشید وارثی کا
شعری مجموعہ
''خوشبوئے التفات''

رشید وارثی صاحب کا مجموعہ ''خوشبوئے التفات'' پیش نظر ہے اور جسم و جان کو معطر کر رہا ہے۔ رشید وارثی صاحب نے نعت گوئی کے موضوع پر کئی زاویوں سے توجہ فرمائی ہے تحقیق و تنقید، تدوین، ترتیب، تزئین اور تحسین ہر زاویئے سے طبع آزمائی کی ہے اور اُردو نعت کے ذخیرہ شعر و ادب کو مالا مال کیا ہے۔

''خوشبوئے التفات'' میں تو بعض ایسی تخلیقی چیزیں نظر سے گزریں کہ رشید وارثی صاحب کے کمالِ فن کے باب میں مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ میں اس جگہ ان کی ایک نظم ''میلادِ مصطفیٰ کے پانچ حروف کی فضیلت'' کی جانب قاری کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا کہ یہ نظم زبان و بیان اور اختراع و ایجاد کے جملہ محاسن کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور رشید وارثی کے نام و کام کی نسبت و روایت کے حوالے سے رشد و ہدایت کی کامل وارث و ترجمان بن گئی ہے۔

اس نعتیہ نظم کی فنی خصوصیت یہ ہے کہ مسدس کی ہیئت میں کہی گئی ہے یعنی ہر بند میں چھ مصرعے ہیں۔ پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ہیں اور آخر کے دو مصرعے ٹیپ بند کے طور پر جُدا گانہ قافیے میں ہیں۔ ان میں پنجتن پاک کے حوالے سے پانچ حروف کی فضیلت کا بیان ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی مدحت

ازلی وابدی پر شاعر نے نہایت خوبی سے ایسے الفاظ کثیر تعداد میں جمع کر لئے ہیں جن میں پانچ حرف آتے ہیں اور جو حضور اکرم ﷺ کی شان میں شاعر کے خلوص کی شدت کو نمایاں کر دیتے ہیں۔ اس نظم میں نبی کریم ﷺ سے محبت کی شدت کے ساتھ ساتھ وہ محنت اور ریاضت بھی نمایاں ہے جو شاعر نے پانچ حرفی لفظوں کی تلاش میں کی ہے۔ نظم اس طور پر شروع ہوتی ہے۔

کس ناز آفریں کا جہاں میں ورود ہے
عرشِ بریں سے بارشِ عطرِ درود ہے
دنیا میں عام رحمتِ ودود ہے
ہر چیز کائنات کی محوِ سجود ہے
آمد ہے آج سرورِ ﷺ خیر الانام کی
خوشبو مہک رہی ہے درود و سلام کی
آمد ہے آج سرورِ ﷺ خیرالانام کی
خوشبو مہک رہی ہے درود و سلام کی

"خوشبوئے التفات" میں مثنوی نما نظمیں اور رُباعیات بھی ہیں اس کے ساتھ ساتھ قطعات بھی پیش کئے گئے ہیں اور موضوع کی وسعت کے اعتبار سے خلفائے راشدین کی مدح وثنا میں منقبتیں بھی ہیں۔ اہلِ بیت کی مدح وثنا میں بھی اشعار ہیں اور دوسرے بزرگانِ دین کا تذکرہ بھی اس کتاب میں بڑی خوبصورتی سے آ گیا ہے۔ ایک منقبت دیکھتے چلئے جس کا عنوان ہے "اسوۂ شبیر علیہ السلام"

کیا اسوۂ شبیرؑ نگاہوں میں سمایا
رہتا ہے مری فکر پہ قرآن کا سایہ

پیغامِ شہِؑ کرب و بلا ذہن میں اُترا
خاکسترِ احساس نے شعلوں کو جگایا

جو پیڑ بھی بستانِ رسالت ﷺ میں اُگا ہے
غیروں کے بھی آنگن میں ہے اس پیڑ کا سایہ

محروم نہیں اُس کی عطا سے کوئی ذرّہ
سورج کی نگاہوں میں کہاں اپنا پرایا

پھٹ جاتے ہیں کہسار بھی سینے کی خلش سے
وہ سوزشِ پنہاں میں رہا ابر کا سایہ

بھر آتے ہیں طوفان میں دریا کے کنارے
شبیرؑ کی پلکوں نہ مگر اشک نہ آیا

کیوں چہرۂ ظلمت پہ رہی دھوپ کی چادر؟
یہ راز مجھے ڈوبتے سورج نے بتایا

یہ عشق کی دولت ہمیں ورثے میں ملی ہے
مکتب سے رشیدؔ ہم نے محبت کو نہ پایا

کتاب کے آغاز میں شاعر نے معارف حمد کے حوالے سے سچ کہا ہے

"حمد کا لفظ شرعی اور علم البیان کی اصطلاح میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعریف وثناء، جلالت وکبریائی، شکر وامتنان اور شیون وصفات کے بیان کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ اصطلاح محل بیان کے اعتبار سے کئی معانی میں استعمال ہوئی ہے۔" جیسے (الحمدللہ) سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا" (الانعام۔۱)، کہیں اللہ تعالیٰ کے شکر وسپاس کیلئے، جیسے "شکر ہے اللہ تعالیٰ کا (الحمدللہ) جس نے اس ضعیف العمری میں مجھے اسمٰعیل اور اسحاق عطا کئے (ابراہیم۔۳۹)۔ کہیں ان دونوں معانی میں، جیسے "سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جو تمام عالمین کا پالنے والا ہے" (الفاتحہ۔۱) کہیں حکم دعا ومناجات کیلئے، جیسے "اور اپنوں کے گناہوں کی معافی چاہو اور اپنے پرودگار کی حمد کرتے ہوئے صبح و شام اس کی پاکی بیان کرو" (المومن۔۵۵)، اور کہیں اظہارِ عبدیت یعنی حکم سجود اور قیام نماز کیلئے بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے "اور اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرو طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب ہو جانے سے پہلے اور رات کی گھڑیوں میں اس کی پاکی بیان کرو" (طٰہٰ۔۱۳۰)۔

"زادِ آخرت"
کا
شاعر جامی بدایونی

اُردو کی نعتیہ شاعری میں جامیؔ کا نام آتے ہی فارسی کے مشہور نعت گو شاعر جامیؔ کا نام ذہن میں اُبھر آتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں مئے خانہ، عشقِ رسول ﷺ کے مے آشام ہیں، اور دونوں کے تخلص منسوب بہ جام ہیں۔ فارسی کے جامیؔ کا پورا نام عبدالرحمٰن جامیؔ اور اُردو کے جامی کا نام عبدالجامع جامیؔ ہے۔ گویا دونوں کے اسمائے گرامی اپنے آغاز وانجام میں متماثل ومتجانس ہیں۔ ان ناموں کی نسبت سے اس وقت جو کتاب میرے پیشِ نظر ہے وہ "زادِ آخرت" ہے۔ بظاہر یہ ایک شعری مجموعے کا نام ہے لیکن یہ عام شعری مجموعہ نہیں بلکہ عربی، فارسی اور اُردو کی شاعری میں خاص الخاص ہے اس لئے کہ اس کا تعلق دنیا کے سب سے بڑے انسان اور انسانیت کے سب سے بڑے محسن حضور اکرم ﷺ کی مدح وثنا سے ہے۔ اس مجموعے کے خالق عبدالجامع جامیؔ بدایونی ہیں جو اپنی ذات میں واقعی جامع الکمالات ہیں۔

"زادِ آخرت" پر سرسری ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا شاعرالواقع بادہ وجام الست سے مخمور اور نشہ حُبِّ رسول ﷺ سے چور ہے۔ جامی صاحب کا چہرۂ نورانی اور ان کی پیشانی کی تابانی گواہی دے رہی ہے کہ ان کی

زندگی کا لمحہ لمحہ ذکرِ نبی ﷺ میں صرف ہوا ہے اور ان کے بدن کا ''رواں رواں'' یادِ الٰہی میں غرق رہا ہے۔ ایسا شخص جب نعتِ نبی ﷺ میں زبان کھولے گا تو یقیناً موتی رُلے گا۔ وجہ یہ ہے کہ نعت گوئی کی اساس محبت اور صرف محبت پر ہے۔ محبت کا نشہ جتنا بھرپور ہوگا نعتیہ کلام اسی قدر اثر و تاثیر سے معمور ہوگا چنانچہ ''زادِ آخرت'' کا سارا کلام الف تا ی حضور اکرم ﷺ کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔

محبت کی سرشاری و مستی کبھی کبھی عاشقانِ رسول ﷺ کو لاشعوری طور پر کہیں سے کہیں لے جاتی ہے اور بعض وقت حمد و نعت کے تقاضوں کا نازک و لطیف فرق ان سے نظر انداز ہو جاتا ہے۔ حضرت جامیؔ بدایونی سے اس طرح کی چوک کہیں نہیں ہوئی، کہنا پڑتا ہے کہ جوشِ محبت کے باب میں بھی ان کی دیوانگی باہوش اور ان کی فرزانگی جنونِ بدوش رہتی ہے۔ اس فطری صلاحیت اور عطائے الٰہی کے طفیل انہیں علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں یہ کہنے کا حق ہے کہ

باچنیں ذوقِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

جامیؔ بدایونی کے یہاں سیرت محمدی اور شمائل نبوی ﷺ کے بیان میں جو لطافت اور حلاوت در آئی ہے وہ تو اپنی جگہ ان کے کمالاتِ فن کا حیرت انگیز اظہار ہے ہی لیکن اس اظہار میں محبت کی جو تڑپ، رُوح کی جو بے چینی، دل و نظر کی جو وارفتگی، طبیعت کی جو عاجزی و فتادگی، جسم و جاں کی جو سپردگی، احساسِ ذات کی جو گمشدگی اور لب و لہجہ کی جو شائستگی و پاکیزگی نظر آتی ہے وہ ان کی ایسی

انفرادیت ہے جو حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی سے والہانہ شیفتگی و توفیقِ الٰہی کے بغیر آدمی کو میسر نہیں آتی۔ جامیؔ صاحب کو یہ شیفتگی و توفیق بحمد للہ میسر ہے اور اس سے بطریقِ احسن کام لیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

اے شافعِ محشر آجاؤ للہ شفاعت فرماؤ
درگاہِ الٰہی میں عاصی پرسشِ کو بلائے جاتے ہیں

کہاں ہیں ہاتھ اس قابل اٹھاؤں خاکِ طیبہ کی
صبا اُٹھنا ذرا یہ میری آنکھوں میں لگا دینا

قربان عطائے ساقی کے یہ خاص کرم ہے ساقی کا
صہبائے ولا کے پیمانے جامی کو پلائے جاتے ہیں

بیٹے کی جُستجو نہ برادر کی ہے تلاش
محشر میں سب کو شافعِ محشر کی ہے تلاش

مُجرم ہوں اِک نگاہِ کرم چاہتا ہوں میں
اُن میں نہیں جنہیں مئے کوثر کی ہے تلاش

صدقے جاؤں کرمِ منزلت افزائی کے
رُو سیاہوں کو شرف ناصیہ فرسائی کے

طلبِ جام کہاں، جامؔی ناکام کہاں
یہ کرم ہیں نگہِ حوصلہ افزائی کے

کاش مل جائے جگہ روضہ سرکار ﷺ کے پاس
رہوں سائے کی طرح ہر در و دیوار کے پاس

ہر مصیبت میں تری نعت رقم کرتا ہے
یہی نسخہ ہے ترے جامؔیِ بیمار کے پاس

اگر ڈوبا تو جامؔی چشمہ کوثر میں اُبھروں گا
کہ اب شرمِ گنہگاری کا پانی سر سے اُونچا ہے

اللہ غنی اللہ غنی کیا شان ہے طیبہ والے کی
ملتا ہے خدا جس رستے سے وہ اُن کی گلی کا رستا ہے

یہ اشعار ''زادِ آخرت'' کی ابتدائی نعتوں کے اشعار ہیں۔ لیکن انہی پر موقوف نہیں، جامؔی بدایونی کی ساری نعتیہ شاعری خواہ وہ نعتیہ غزل کی صورت میں ہو خواہ نعتیہ غزلوں کی تضمین کی صورت میں، خواہ مسدس و مخمس کی ہیئت میں ہو یا رُباعیات وقطعات کی شکل میں۔ جملہ لفظی ومعنوی محاسن سے مالا مال ہے اور قاری پر نہایت خوشگوار وحیرت انگیز اثر ڈالتی ہے۔

''نغمہ عندلیب''
سید محمد یوسف علی
کا نعتیہ مجموعہ

حضرت خواجہ حافظ سید محمد یوسف علی عزیز اولائیؔ سلیمانی کا مجموعہء نعت ''نغمہءعندلیب'' اس وقت میرے سامنے ہے اور یہ توفیقِ الٰہی، دل ونگاہ دونوں کی سرمستی وسرشاری کا سامان میسر ہے۔ یہ سرمستی وسرشاری بے سبب نہیں ہے، اس مجموعہءنعت کے خالق نے اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک مصرعہ اور ایک ایک شعر میں اپنے بےنظیر وبےمثال ممدوح حضرت محمد ﷺ کے طفیل ایسی سرشاری ومستی سمو دی ہے کہ کوئی صاحبِ ذوق وصاحبِ دل اس کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نعتیہ شاعری یوں بھی جملہ اصنافِ سُخن سے مختلف ومنفرد ہے۔ اس کے تقاضے زمانے سے الگ اور اس کے لوازم سب سے جدا ہیں۔ جب تک حضور اکرم ﷺ کے اُسوہ حسنہ کی پیروی سے شاعر کے اعمال واخلاق مالا مال نہ ہوں اور اس کا ذہن بشریت والوہیت کی حدود کے فرق سے آشنا نہ ہو وہ شاعری کی دیگر اسالیب واصناف میں تو کمالِ فن دکھا سکتا ہے لیکن نعت گوئی کے منصب سے کماحقہ، عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ نعت گوئی کا راستہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ ذرا سا قدم ڈگمگایا، سعئ حسنہ کچھ سے کچھ

ہو جاتی ہے۔ رحمۃ اللعالمین ﷺ کی مدح وثناء، حمدِ ربّ اللعالمین' کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ نعت گوئی کی یہ روش مستحسن نہیں معیوب ہے، الحمدللہ! حضرت خواجہ حافظ محمد یوسف علی عزیز اولیأ سلیمانی کی نعتیہ شاعری اس عیب سے یکسر پاک ہے اور پاک کیوں نہ ہو کہ انہیں ہر ہر قدم پر حمد و نعت کے اس نازک ولطیف فرق کا پورا پورا احساس ہے تبھی تو فرماتے ہیں کہ

ملحوظ نعت میں ہے حدّ ادب عزیزؔ
کہہ دیں نہ اہلِ ذوق کہ حد سے نکل گیا

بہ اعتبارِ ہیئت فنی، دنیائے شعر میں غزل، قصیدۂ طُور ہے اور قصیدہ غزل طور، وہ اس لئے کہ دونوں میں مطلع کے ساتھ تمام اشعار میں قوافی ردیف کا یکساں التزام واہتمام ہوتا ہے اور نعتیہ شاعری میں چونکہ موضوع یا موضوعات کا اختلاف بھی ختم ہو کر اکائی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس لئے حُبّ رسول ﷺ کی سرشاری، غزل ہو یا قصیدہ دونوں کو یکساں پُر اثر بنا دیتی ہے حضرت خواجہ عزیز الاولیأ سلیمانی نے اپنی وجدانی کیفیات کو اپنی نعتیہ شاعری میں صرف غزل اور قصیدہ تک محدود رکھا ہے اور ایسے کمالاتِ شاعرانہ کے ساتھ کہ کبھی تو ان کی نعتیہ غزلیں قاری وسامع کو مولانا احمد رضا خان صاحب کی غزلیہ شاعری کی یاد دلاتی ہیں اور کبھی محسن کاکوری کے قصیدہ لامیہ

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

کی رُوح پرور فضا اسے دل و دماغ کو منور و معطر کر دیتی ہے۔ میں قصیدے کی مثال میں حضرت خواجہ عزیز الاولیأ سلیمانی کی اس طویل نعت کو بطورِ حوالہ پیش کر دوں گا جس کا مطلع ہے۔

حیراں ہیں سب رتبہ شناسانِ محمد ﷺ
کس طرح لکھیں مدحتِ شایانِ محمد ﷺ

اس قصیدے میں کم وبیش ایک سو اشعار ہیں اور محاسنِ لفظی و معنوی سے ایسے لبالب ہیں کہ سرورِ وجدانی کیفیتوں کے جام چھلکاتے ہیں، زبان و بیان کے رنگ جماتے ہیں اور حضورِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ واسوۂ حسنہ کے جلال و جمال کے ایسے مناظر دکھاتے ہیں کہ ان اشعار کو سننے اور پڑھنے والے خود بھی ثناء خوانِ محمد ﷺ کی صف میں شعوری یا لاشعوری طور پر آ کھڑے ہوتے ہیں یہ کسی شاعرِ کی نعت گوئی کا ایسا وصف ہے جو توفیقِ الٰہی کے بغیر میسّر نہیں آتا۔ بحمداللہ یہ توفیق "نغمۂ عندلیب" کے شاعر کو حاصل ہے۔ ہم حضرت خواجہ عزیز الاولیأ سلیمانی کی اس عظیم کاوش پر جس قدر ناز کریں کم ہے۔

"مدحتِ رسول ﷺ"

اور

زاہد فتح پوری

عشقِ رسول ﷺ، ایک ایسا جذبہ پاکیزہ ہے جسے مدحتِ رسول کا لفظی پیکر دینے میں ایک صاحبِ دل مسلمان شاعر کو غیر معمولی سرور و سکون میسر آتا ہے لیکن ہر شخص و ہر شاعر اس کی پیکر تراشی پر قدرت نہیں رکھتا، ہاں اگر توفیقِ الٰہی معاون و مددگار ہو تو پھر یہ کام مشکل نہیں ہوتا۔

زاہد فتح پوری، جو ہم عصر اُردو شعراء میں ایک قابلِ توجہ مقام رکھتے ہیں۔ بحمد اللہ مدحتِ رسول کے بابِ خاص میں بھی بتوفیقِ الٰہی خاص شہرت کے مالک ہیں چنانچہ حمد و نعت پر مشتمل ان کا شعری مجموعہ بہ عنوان "نقشِ اوّلیں" اس وقت میرے سامنے ہے اور میں بقدر لب و دنداں اس سے لطف اٹھا رہا ہوں۔ یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کی ایک بہت مختصر سی کتاب ہے یعنی ظاہری قد و قامت کچھ ایسی نظر گیر نہیں لیکن قدر و قیمت میں یہ مجموعہ ایسا دل پذیر ہے کہ شاعر کی فنکارانہ صلاحیتوں کی داد بہر حال دینی پڑتی ہے۔

نعت گوئی کے باب میں اسد اللہ خاں غالب جیسے بڑے شاعر نے اپنے عجز کا اعتراف اپنی ایک نعتیہ غزل کے ایک شعر میں اس طور پر کیا ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک، مرتبہ دانِ محمد است

یعنی غالب خود کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ:

"اے غالب تو نعتِ رسول ﷺ کو خالقِ کائنات کے حوالے کر دے کہ حقیقتاً وہی حضور اکرم ﷺ کے اصل مرتبے سے واقف ہے"۔

اس عجز کے باوجود غالب نے اعلیٰ درجے کی نعتیہ شاعری کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، اُردو میں بھی اور فارسی میں بھی ان کی مشہور مثنوی اس سلسلے میں بڑی شہرت رکھتی ہے۔ مجھے اس طرح کی صورتِ حال زاہد فتح پوری کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے غالب کے طور پر اپنی عجزِ نعت گوئی کا اعتراف اگرچہ اس طور پر کیا ہے

بیاں کیا ہو بھلا شانِ محمد ﷺ
خدا خود ہے ثناء خوانِ محمد ﷺ

پھر بھی ان کا جذبہء عشقِ رسول ﷺ اور مدحت نگاری اللہ کے حضور ہاتھ پھیلاتے ہوئے دعا کرتا رہتا ہے کہ

ایک اک حرف سے آئے تری خوشبو کی لپٹ
زاہدِ خستہ جگر کرے مدحت تیری

زاہد فتح پوری زندگی بھر نعت کہتے رہے اور اپنے لئے نعت گوئی کو

سامانِ آخرت جانا اور زندگی کے ہر ہر قدم پر حضور نبی کریم ﷺ کی راہنمائی کو اپنے لئے سرمایہء دل وجاں سمجھا صرف ایک نعتیہ غزل کے دو شعر دیکھتے چلیے۔

زہے وہ شوق کہ ہو جس میں جستجوئے رسول
خوشا وہ قلب کہ ہو جس کو آرزوئے رسول

زباں پہ ذکرِ محمدؐ سدا رہے زاہدؔ
وہ زندگی ہے کہ ہو وقفِ گفتگوئے رسولؐ

راقم علیگ کا شعری مجموعہ
''طائرِ معرفت''
پر ایک نظر

حمد ونعت ومناجات پر مشتمل جناب راقم علیگ کا شعری مجموعہ ''طائرِ معرفت'' اپنی دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ میرے سامنے ہے اور اس کا مطالعہ، دیدہ ودل دونوں کے لئے سامانِ تسکین وطمانیت فراہم کررہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں جو کچھ ہے وہ رسمی واکتسابی شاعری سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ سچے کھرے اور درد بھرا دل رکھنے والے انسان دوست شاعر کی روح کی آواز ہے، ایسی آواز جو از دل خیزد بر دل ریزد کے مصداق ہے۔ نتیجتاً اس کا مطالعہ ہر صاحبِ ذوق قاری کے لئے عجب طرح کی مستی وسرشاری کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

بہ اعتبارِ بلند پروازیء تخیل: ''طائرِ معرفت'' کی قدر وقیمت غیر معمولی ہے۔ یہ صفتِ خاص، اس شعری مجموعے میں راقم علیگ کی فطری شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ ساتھ ان کی شرافت نفسی اور علوئے نسبی کا عطیہ ہے وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور گہوارۂ علم وفکر کے پروردہ خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں اپنے گھر سے بھی بہت کچھ ملا ہے۔ اور اپنے زورِ بازو سے بھی انہوں نے اپنے آپ کو حد درجہ مہذب وشائستہ بنایا ہے۔ گلزار مسجد کراچی کے خود پوش عالی

مرتبت بزرگ حضرت مولانا محمد یوسف عزیز کی صحبتوں سے بھی فیضان پایا ہے۔ اور استاذی پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب جیسی بزرگ شخصیت کے سلسلۂ رشد و ہدایت سے بھی اپنا رشتہ جوڑا ہے۔ ان نسبتوں کے تعلق سے راقم علیگ بذاتِ خود ایک قابل احترام شخصیت کے مالک ہیں۔

راقم علیگ نے ''طائرِ معرفت'' میں اپنے جذبات و محسوسات کا جس خوبصورت پیرائے میں اظہار کیا ہے، وہ تو قاری پر اپنی اثر پذیری دکھاتا ہی ہے، لیکن انہوں نے ''نقوشِ حیات'' کے عنوان سے نثر میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اپنے متن و مواد کی پاکیزگی و لطافت کے سبب کم کارگر نہیں ہے۔ اس سے ایک حساس آدمی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ مجھے راقم کے نقوشِ حیات نے اتنا ہی متاثر کیا جتنا کہ ان کے مجموعہ کلام نے۔

جہاں تک راقم علیگ کے ''طائرِ معرفت'' اور اس کے مشمولات کا تعلق ہے، وہ شروع سے آخیر تک سچے جذبات و پاکیزہ خیالات سے لبالب ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ شعوری کوشش یا ذہنی مشق سے نہیں کہا۔ بلکہ وفورِ جذبات وسیلِ محسوسات کے تحت کہا ہے۔ تب ہی تو جو کچھ کہا ہے وہ سارے کا سارا بے تکلف و شگفتہ لب ولہجہ میں ڈھل گیا ہے۔

یوں تو راقم علیگ کے فکر و نظر کی چاندنی ان کے سارے کلام پر چھٹکی ہوئی ہے، لیکن ان کی قوتِ متخیلہ اور قادر الکلامی کی اصل جولان گاہ وہ نعتیں، مناجاتیں اور اسماء الحسنیٰ کی وہ منظوم تفسیریں ہیں جو اپنی نظر گیری و دلکشی کا آپ

اپنا جواب ہیں اور اپنے پرائے، سب سے راقم کی شاعرانہ صلاحیت اور لسانی حذاقت کا لوہا منواتی ہیں اور صاحبانِ ذوق کو یہ کہنے پر مجبور کرتی ہیں کہ اللہ اگر توفیق نہ دے، انسان کے بس کا کام نہیں، یا یوں کہیے کہ:

اس سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

''طائرِ معرفت'' کی شاعری مشمولات فنی اعتبار سے قابلِ داد ہیں۔ لیکن ''تاج دارِ دو عالم'' کے عنوان سے جو نظم کہی گئی ہے جس کا پہلا بند اس طور پر ہے

ہر طرف آپؐ کے انوار نظر آتے ہیں
مجھ کو صحرا میں بھی گلزار نظر آتے ہیں
دل کے آئینہ میں سرکارؐ نظر آتے ہیں
عرش پر سیّدِ ابرارؐ نظر آتے ہیں
کیوں نہ پھر سیّدِ کونینؐ کی عظمت ہو رقم
یا الٰہی ترے محبوبؐ کی مدحت ہو رقم

ہر بند کے اوّلین چار مصرعے قطعہ بن باقی دو مصرعے ہم قافیہ ہیں لیکن پہلے چار مصرعوں سے الگ ہیں۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ہر بند کا آخری مصرعہ یہ ہے۔

''یا الٰہی تیرے محبوبؐ کی مدحت ہو رقم''

یعنی شاعر نے دعا مانگی ہے کہ اس کے لفظوں میں حضور ﷺ کی نعت گوئی

کا سلسلہ عمر بھر قائم رہے اور اس کے اثرات بھی قارئین پر مرتب ہوتے رہیں۔

کتاب کے آخر میں علامہ اقبال کے رنگ میں ایک بہت دل آویز نظم ہے جس کا عنوان ہے "قوم سے خطاب" اس کا پہلا اور آخری بند دیکھئے۔

مومن کی حقیقت میں تو ایماں کی ضیا دیکھ
خود اپنے عمل تول، نہ اوروں کی خطا دیکھ
اعجازِ حقیقت کو سمجھ، دیکھ! ذرا دیکھ
یہ لمحہ غنیمت ہے ذرا ہوش میں آ دیکھ
گر دیکھنا ہے اہلِ نظر، اہلِ صفا دیکھ
عارف کی نظر سے نظرِ حسنِ رسا دیکھ

احساس کی چادر کو ذرا تن سے ہٹا دے
محنت کو نکل، جرات و عظمت کی ضیا دیکھ
اے وارثِ تخلیقِ جہاں! بھول گیا کیا؟
لکھا ہوا قرآں میں ہے تیرے لئے کیا دیکھ
جذبات میں راقم کے ہے اک موجِ طلاطم
طوفان میں جذبات کے تو اس کی ادا دیکھ

اس سے پوری نظم کے تاثر کا اور شاعر کی قدرتِ کلام کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے۔

مبارک مونگیری
"ذکرِ ارفع"
کی روشنی میں

مبارک مونگیری ہمارے عہد کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کی انسان دوستی اور جن کے کلام کی حیات افروزی، کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ان کی شاعری کا ہر پہلو اور ہر موضوع، اس امر کا مظہر ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کی سیاسی وسماجی اور اس میں سانس لینے والی اجتماعی زندگی کے نباض وترجمان ہیں۔

اس ترجمانی میں انہوں نے انسان اور انسانیت کو محترم ومعتبر بنانے کے جو خواب دیکھے ہیں، ان کیلئے ایک مدت تک ان کی آنکھیں بے خواب رہی ہیں لیکن ان کی بے خوابی رائیگاں نہیں گئی۔ خوابوں کے شرمندہ تعبیر ہونے کے آثار وامکانات پیدا ہوئے اور پیدا ہورہے ہیں۔ ظالموں کے ہاتھ روز بروز کمزور ہوتے جارہے ہیں اور مظلوموں میں جبرواستبداد سے آنکھ ملانے کا عزم وحوصلہ بڑھتا چلا جارہا ہے ایسا ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے، اس لئے کہ مبارک مونگیری نے اہل ثروت وصاحبان کی مدح سے اپنے ذہن وقلم کو کبھی آلودہ نہیں کیا بلکہ صرف دنیا کے سب سے بڑے آدمی اور انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت للعالمین ہی کو مدح وثناء کے لائق جانا۔

یہ بھی اسی ذاتِ مبارکہ کا فیضانِ خاص ہے کہ مبارک مونگیری نے اس مدح وثناء کو کسی ایک ہیئت شعری میں بند کرنے کی کوشش نہیں کی، شاید ایسا کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعمتیں اور رحمتیں اپنے امتیوں اور خدا کے عام بندوں پر ہمہ رخ وہمہ جہت اور ہمہ رنگ وہمہ صورت ہیں۔

نتیجتاً مبارک مونگیری نے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ مبارکہ کی ہمہ رنگی وہمہ جہتی کو اپنے دامنِ خیال میں سمیٹنے کیلئے شعری ہیئتوں کے سارے دروازے کھول دیئے ہیں۔

شاعری کی تقریباً جملہ اصناف مثلاً مثنوی، غزل، مسدس، مخمس، رُباعی، تضمین، قطعہ اور جدید نظم، سب کو انہوں نے نعت گوئی کا وسیلہ بنایا ہے اور ہر وسیلے کو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید اور سچے جذبوں میں ڈھال کر کارگر وکارکشا بنا دیا ہے۔

ہر صنفِ سخن کے حوالے سے مبارک مونگیری کی نعت گوئی کا تذکرہ اس جگہ ممکن نہیں صرف تضمین کے حوالے سے بات کروں گا۔ تضمین ایک مشکل صنفِ سخن ہے اس میں شاعر کسی دوسرے کے کلام کو اپنے اشعار کے ساتھ استعمال کرتا ہے اور دونوں کو ملا کر ایک ایسی اکائی بنا دیتا ہے کہ شاعر کی قوتِ تخلیق پوری طرح منور ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال مبارک مونگیری کے ہاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے شیخ سعدیؒ کے مشہور نعتیہ قطعہ کی تضمین اس طور پر کی ہے۔ چند قطعات دیکھئے۔

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ
کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ
صَلُّوْا عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ

کوئی کر سکے تری مدح کیا کہ نہ تاب ہی نہ مجال ہی
نہ رسا ہو ذہنِ بشر کبھی، نہ گزر کناں ہو خیال ہی
ترِے مرتبے سے ہے آشنا، وہی ربِ عز وجلال ہی
کہ ہے رَفَعنا لکَ ذِکرکَ پہ گواہ صدق مقال ہی

تجھے جس نے فخرِ رُسل کیا ہمیں جس نے خیرِ اُمم کیا
اُسی بے نیاز کی ہے قسم، ہمیں بے نیازِ الم کیا
لبِ مدعا بھی نہ وا ہوئے کہ گدا پہ تو نے کرم کیا
ابھی ہونٹ پر بھی نہ آسکا ابھی ذہن میں تھا سوال ہی

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ
کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ
صَلُّوْا عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ

تری ذات عظمتِ کُل بنی، تری شان شانِ تمام ہے
جہاں جبرئیل کے پر جلیں وہ بلند تیرا مقام ہے
جو ہے بادشاہوں سے بھی سوا ترے آستاں کا غلام ہے
اسے کہہ سکیں گے انسؓ ہی کچھ یہ بتا سکیں گے بلالؓ ہی

بَلَغَ العُلٰی بِکَمَالِہٖ
کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
حَسُنَت جَمِیعُ خِصَالِہٖ
صَلُّوا عَلَیہِ وَآلِہٖ

تری شان رحمت عالمیں ترا لطف سارے جہان پر
تری بارگاہِ نیاز سے ہے وہ کون جو نہیں بہرہ ور
مگر اک مبارکؔ بے نوا ترے در کا عبدِ حقیر تر
رہے تا بکے زبوں بخت ہی رہے تا بکے زبوں حال ہی

مجھے یقین ہے کہ ان کی نعت گوئی دین و دنیا دونوں میں ان کی سرخروئی کا وسیلہ ثابت ہوگی۔

حنیف اخگر کے مجموعہ حمد و نعت و منقبت
"خُلقِ مجسم"
پر ایک نظر

حضرت اخگرؔ ملیح آبادی، عہدِ حاضر کے ان اُردو شعرا میں سے ہیں جن کا نام و کام دیارِ مشرق سے لے کر ایوانِ مغرب تک، بشمول امریکہ و کینیڈا اور یورپی ممالک، قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ہر ادبی و شعری محفل میں انہیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی شرکت و موجودگی کو باعثِ توقیر و تبریک سمجھا جاتا ہے، اپنے ہم عصروں میں انہیں یہ قابلِ رشک مقام، ان کی خوش خلقی و خوش فکری اور خوش گوئی و خوش کلامی نے دیا ہے سچ یہ ہے کہ ان کی طبیعت کا عجز و انکسار، ان کی سیرت و شخصیت کا ایسا طاقتور پہلو ہے جو بڑے سے بڑے سرکش و مخالف کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے، عارضی طور پر نہیں بلکہ زندگی بھر کے لئے، میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ جو ایک بار بھی اُن سے ملا، ان کی شخصیت کی مقناطیسیت کے تحت انھیں کا ہو کر رہ گیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اخگرؔ ملیح آبادی اُردو کے نامور شاعر ہیں ان کے کمالِ فن کے عام و خاص سب ہی معترف ہیں، ان کے دو شعری مجموعے "چراغاں" اور "خیاباں"، کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور اہلِ فکر و فن سے خراجِ تحسین لے چکے ہیں، ان کا تازہ شعری مجموعہ بابرکت و عظیم تر موضوعات اور جاں گداز اور

دل نشیں اُسلوب کے ساتھ بنام ''خُلقِ مجسّم'' منظرِ عام پر آیا ہے اور چراغاں اور خیاباں کے پس منظر کے ساتھ ایک مومن کیلئے طمانیتِ قلب و آسودگی، جاں کا حیرت ناک پیش منظر لے کر آیا ہے، ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کہ اس نئے شعری مجموعے کا تعلق عام غزلیہ ونظمیہ شاعری سے نہیں بلکہ کائنات کے عظیم ترین موضوع اور موضوع سے نسبتِ خاص رکھنے والے اُن اشخاص سے ہے جن کی مدح وثنا کو منظوم صورت میں نعت ومنقبت کا نام دیا گیا ہے۔

نعتیہ ومنقبتیہ شاعری کا ذکر آیا تو اس مجموعے کے مطالعے سے پہلے قاری کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہے کہ نعت ومنقبت کی شاعری کے تقاضے، شاعری کے عمومی تقاضے سے بہت مختلف ہوتے ہیں، اس بدیہی حقیقت کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ شاعر اور شاعری کی ہر صنف کے لئے موزونیِ طبع کے ساتھ علم وعروض وقافیہ سے قدرے واقفیت، علم بیان بدیع سے مناسبت و آگہی، زبان وبیاں کے رموز ونکات سے آشنائی اور وسعتِ مطالعہ کے ساتھ جولانیِ فکر کی ضرورت ہوتی ہے لیکن نعتیہ ومنقبتیہ شاعری ان اوصاف سے آگے بڑھ کر اس دیوانگیِ شوق سے جذبہ والہانہ کا تقاضا کرتی ہے جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات اور ان کی ذات وصفات سے مستفید ہونے والے اشخاص کے لئے مخصوص ہے لیکن اس نوع کا انتساب قلبی واختصاصِ شخصی سب کو نہیں، کسی کسی کو میسر آتا ہے بحمد للہ محمد حنیف اخگر کو یہ نعمتِ عظمیٰ من جانب اللہ عطا ہوئی ہے اس عطا کو انہوں نے نعت ومنقبت کے وسیلے سے اپنے جسم وجاں کے

لئے دائمی دارالصحت اور قلب وروح کے لئے ادبی دارالشفاء بنالیا ہے، جگر مراد آبادی نے شاید ایسے ہی رتبہ بلند اور مقامِ مسعود کے لئے کہا تھا کہ

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام تو ہے عرفانِ محبت عام نہیں

حنیف اخگر کو اس مقام بلند تک پہنچانے میں یقیناً توفیقِ الٰہی کا بڑا ہاتھ ہے لیکن اتنی بات ذہن میں رہے کہ یہ توفیق انہی کے حصے میں آتی ہے جو اس توفیق کے متمنی اور جویا ہوں نیز جنہوں نے قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو طاقتور اور کارگر بنانے کیلئے اپنے اسلافِ برگزیدہ اور اطرافِ پاکیزہ سے شکر گزار اور احسان مندی کے جذبات کے ساتھ اخذ واستفادہ کیا ہو، حنیف اخگر کی بڑائی کا ایک بڑا نشان یہ بھی ہے کہ حمد ونعت کے باب میں جہاں وہ توفیقِ الٰہی کے شکر گزار ہیں وہیں اپنے بزرگوں کے فیضان کے بھی معترف واحسان مند ہیں تبھی تو لکھتے ہیں:

''حمد ونعت ومنقبت کے سلسلے میں بھی میں نے اپنے والدین کی پسندیدگی کے تحت ابّا میاں مرحوم قاضی سید محمد شریف اثر کمسنڈوی، کے علاوہ امیر بینائی، محسن کاکوروی، جگر مرادآبادی، حسرت موہانی کی نعتوں کے بغور مطالعے کے ساتھ پروفیسر حفیظ تائب، رونق بدایونی، عبدالحمید صدیقی لکھنوی اور بالخصوص شاعر لکھنوی (مرحوم) کی نعتوں سے نہ صرف بار بار محظوظ ہوا ہوں بلکہ ان کو اپنا معیار مقرر کیا ہے اور بہت کچھ سیکھا ہے''۔

یہ سطور بتاتی ہیں کہ ''خلقِ مجسّم'' کا شاعر، ایک بھرپور ادبی و شعری پس منظر رکھتا ہے، اس کے تخلیقی ذہن کی تربیت، شعر و ادب کے نکھرے ہوئے ماحول میں ہوئی ہے اس نے اپنے عہد کے بلند پایہ نعت کے شعراء کے ساتھ قدیم اساتذۂ اُردو کے فکر و فن سے مولانا حسرت موہانی کی طرح فیض اُٹھایا ہے بقول حسرت ''طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض'' حسرت و اخگر ہم وزن ہیں اس لئے اس مصرعے کو یوں بھی پڑھ سکتے ہیں ''طبعِ اخگر نے اُٹھایا ہے ہر استاد سے فیض''، نہ صرف فیض اُٹھایا ہے بلکہ اس فیضان کو اپنی تخلیقات میں انہوں نے سمو کر، اُردو کی نعتیہ شاعری کو اور اس کی تاریخ کو حسین و دقیع اور معتبر اور موقر بنادیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا اور جیسا کہ خود شاعر کو احساس و اعتراف ہے کہ نعت گوئی کا تعلق فکر و فن اور علم و ہنر سے زیادہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے عقیدت و محبت سے ہے جب تک ایک مومنِ باصفا کا دل بادۂ حُبِّ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار نہ ہو، آنکھوں میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دینے کی آرزومندی اور جذبہ شوق حضوری میں مدینۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سانس لینے کی تمنائے بیتاب موجود نہ ہو، نعت کا نزول نہیں ہوتا، یہ وہ معاملاتِ حُبِّ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو ایک سچے شاعر کو روزگار و غمِ ذات سے بے پرواہ و بے نیاز رکھ کر وادی حمد و نعت میں گُم کر دیتے ہیں خود اخگر کے لفظوں میں

غمِ دنیا نہ غمِ دل میں مسائل میرے
حمدِ رب، نعتِ محمد ﷺ ہیں مشاغل میرے

تحفہ یہ نعت گوئی کا کچھ نہیں کہ ہم
شیرینیٔ زباں کے سزاوار ہوگئے

اِک چراغِ عزمِ طیبہ چاہئے
کیا سفر اور کیا سفر کا فاصلہ

علمِ قرآں سہل ہے اور سہل تر علمِ حدیث
سر بہ سر تفسیرِ قرآں ہیں سخن ہائے رسول ﷺ

ہر وقت ہے اب منظرِ طیبہ مرے آگے
وہ اُٹھ گیا حائل تھا جو پردہ مرے آگے

دل وہ ہے کہ جس میں ہو تمنائے مدینہ
سر وہ ہے کہ جس سر میں ہو سودائے مدینہ

دل دیکھتا رہتا ہے مدینے کے یہی خواب
جب آنکھ میں کھولوں نظر آجائے مدینہ

اب جو خوشبو سے معطر ہے صبا کا دامن
خاک تھا آپ ﷺ کے دامن کی ہوا سے پہلے

شاعر کے قلب ونظر، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت کے لئے کیسے بیتاب ہیں، دل وجاں پر ان کے فراق میں کیا گزری ہے اور ان کے جسم کا رُواں رُواں دیدارِ روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیسا بے چین ومضطرب ہے، اس کا اندازہ میرے بیان سے نہ ہوسکے گا اس لئے شاعر کے اضطرابِ قلب وروح کا حال خود شاعر کی زبان سے سنیئے اور حسنِ بیان کو سراہتے ہوئے شاعر کے اشتیاقِ بے پایاں اور اضطرابِ بے کراں کی مصوری کی داد دیجئے۔

ہر گھڑی چشمِ تصور سے مدینہ دیکھوں
کاش آجائے مجھے یوں بھی نظارہ کرنا

توفیقِ نعت گوئی ہے اللہ کا کرم
کاوش یہ ہے ہنر کی نہ زورِ بیاں کی ہے

تمام عمر میں نعت و سلام لکھتا رہوں
تمام عمر اسی میں تمام ہو

نعت گوئی اور منقبت نویسی کے حوالے سے حنیف اخگر کا ایک اور کمالِ فن قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے صرف یہی نہیں کہ اپنی طبع زاد زمینوں اور بحروں میں قابلِ صد تحسین اشعار کہے ہیں بلکہ اساتذۂ قدیم اور نہایت معروف شعراء کی زمینوں اور بحروں میں بھی کامیاب نعتیں کہہ کر اپنی قادر کلامی اور غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کیا ہے چند نمونے دیکھئے:

آنکھ ہر لمحہ برستی کبھی ایسی تو نہ تھی
دیکھ کر اور ترستی کبھی ایسی تو نہ تھی
اس جہاں میں بھی میسر نہ ہو ثانی جس کا
ان سے پہلے کوئی ہستی کبھی ایسی تو نہ تھی

سنتا ہوں جب روایتِ شق القمر کہیں
پاتا ہوں اپنے سینے میں رشکِ قمر کو میں
دیکھوں مہ و نجومِ محمدؐ کے نقشِ پا
اور آفتاب ذرّۂ گردِ سفر کو میں

حکمِ سرکارؐ کا محتاج رہا اپنا قلم
نعت ہم لکھ نہ سکے ان کی رضا سے پہلے
اذنِ سرکار کے پابند تھے ورنہ اخگر
ہم مدینے میں پہنچ جاتے صبا سے پہلے

مرا شوقِ نعتِ رسولؐ ہے کبھی سوز میں کبھی ساز میں
کبھی نذرِ نغمۂ جاں کروں کبھی دلِ شعورِ نیاز میں
کوئی حدِّ سوزِ دروں نہیں مجھے چیں ہے نہ سکوں کہیں
بہ کمالِ عشقِ نبی کہاں، کوئی بات صغیۂ وراز میں

یہ اشعار اخگر کی جن نعتوں سے لئے گئے ہیں وہ علی الترتیب بہادر شاہ ظفر دہلوی، اسد اللہ غالب دہلوی، شوکت علی خان فانی دہلوی اور علامہ اقبال کی مقبول ترین زمینوں اور بحروں میں ہیں اور کیسی کامیاب اور بااثر ہیں اس کا صحیح اندازہ اخگر کی پوری نعتوں کے مطالعے ہی سے ممکن ہے مجھے تو اس جگہ صرف اس قدر کہنا ہے کہ اخگر کا کمالِ شعر گوئی، صرف غزلیہ اور نظمیہ شاعری تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی حمدیہ نعتیہ اور منقبتیہ شاعری بھی حد درجہ خوبصورت اور پُر کیف ہے اور اسی لئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اخگر کا تازہ نعتیہ مجموعہ ''خُلقِ مجسّم'' اُردو نعت گوئی کی تاریخ میں محض ایک اضافہ نہیں بلکہ نہایت حسین ودقیع اور موقر و معتبر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے میں انہیں اس غیر معمولی کامیابی پر دلی مبارک باد دیتا ہوں۔

''اعجازِ مصطفیٰ''
کا شاعر
اعجاز رحمانی

اعجاز رحمانی صاحب اُردو کے معروف شاعروں میں سے ہیں جن کی آواز قدیم وجدید کا ایک نہایت دلکش آہنگ رکھتی ہے۔ وہ غزلیں کہیں یا نظمیں، موضوعاتی شاعری کو ہاتھ لگائیں یا غیر موضوعاتی کو، اس آہنگِ خاص سے ان کی شاعرانہ لے الگ نہیں ہوتی حتیٰ کہ ''نعت'' جیسے مختص ومشکل موضوع میں بھی انہوں نے اپنی اس خصوصیت کو بکمال برقرار رکھا ہے۔

اُردو میں نعتیہ شاعری کا رواج آج سے نہیں شروع سے ہی ملتا ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ہماری نعتیہ شاعری کا زیادہ تر حصّہ رسمی ہے۔ اس میں وہ محکسن نظر نہیں آتے جو شاعری کے معیار کو بلند کرتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر شعراء نے ''نعت'' کے موضوع کی معنوی عظمت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا۔ ان کی نظر بالعموم آنحضرتؐ کی شکل وصورت اور معجزات سے آگے نہیں بڑھی، لیکن اعجاز رحمانی صاحب نے ان سے آگے بڑھ کر حضور اکرم ﷺ کے اخلاق و کردار کو بھی مرکزِ نظر بنایا ہے۔ نتیجتاً اُن کی نعتیہ شاعری کی معنوی سطح خاصی بلند ہوگئی ہے۔ پھر یہ بھی نہیں ہے کہ انہوں نے نعت گوئی کے باب میں غیر ضروری صناعی یا بے جا تکلفات سے کام لیا ہو، اُن کی نعتوں کا زیرِ نظر مجموعہ ''اعجازِ مصطفیٰ'' کے مطالعے کے

بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے، پورے جوشِ عقیدت اور ولولے کے ساتھ کہا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی نعتیہ شاعری رسمی خیالات کا مجموعہ نہیں بلکہ ان کے دِل کی آواز ہے اور دل کی آواز اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ ان کی نعتیہ شاعری قبولِ عام حاصل کر چکی ہے۔ وہ جتنے اچھے شاعر ہیں اس سے زیادہ اچھے نعت خواں ہیں۔ ان کی آواز اور ادا کے الفاظ دونوں سے پتہ چلتا ہے وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں دل کی گہرائیوں سے کہہ رہے ہیں۔

ایک نعت دیکھتے چلئے

اللہ رے یہ منزلِ معیارِ مصطفےٰؐ
ہر منصب جلیل سزاوارِ مصطفےٰؐ

ہر دَور میں رہے گا جو دُنیا کا رہنما
اخلاقِ مصطفےٰؐ ہے وہ کردارِ مصطفےٰؐ

آئینہ دارِ سیرت خیرؐ الانام تھے
اصحابؓ باصفا تھے وفادارِ مصطفےٰؐ

دُنیا میں دینِ حق کی اشاعت کے واسطے
موجود آج بھی ہیں رضا کارِ مصطفےٰؐ

شاہ و گدا کا فرق نہیں ہے جہاں کوئی
دربارِ مصطفےٰؐ ہے وہ دربارِ مصطفےٰؐ

ہم غیر کے اُصول کو اپنائیں کس لئے
اپنے لئے مثال ہے کردارِ مصطفےٰؐ

مدحت سرا رسولؐ کے انسان ہی نہیں
اللہ کا بھی شغل ہے اذکارِ مصطفےٰؐ

مہتاب کیا ہے عکسِ جبینِ رسولؐ ہے
خورشید کیا ہے پرتوِ رخسارِ مصطفےٰؐ

اب دِل سے دور ہے غمِ دُنیا و آخرت
بیٹھا ہوں زیرِ سایۂ دیوارِ مصطفےٰؐ

اعجاز ان کا فہم سے بالا ہے مرتبہ
جو بن گئے ہیں خادمِ سرکارِ مصطفےٰؐ

حضور اکرم ﷺ کی محبت میں ڈوب کر پوری عقیدت کے ساتھ انہوں نے نعت کہی ہے تب ہی تو ان کی شعر گوئی اور شعر خوانی کا اثر یہ ہوا ہے کہ وہ پاک

وہند سے باہر کی دنیا یعنی سات سمندر پار مثلاً امریکہ، کینیڈا اور یورپ تک میں توجہ سے سنے جاتے اور پڑھے جاتے ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ افسوس کہ ان کی نعتیہ شاعری پر تفصیل سے اظہارِ خیال کا وقت میرے پاس نہیں اسلئے ان کی مندرجہ ذیل دو نعتیں درج کر کے قارئین سے چاہوں گا کہ وہ ان سے لطف اندوز ہوں۔

بلند عرشِ برین سے مقام کس کا ہے
درُود پڑھتے ہیں جس پر وہ نام کس کا ہے

یہ بات آپ کو قرآن خود بتائے گا
نزول کس پہ ہوا ہے کلام کس کا ہے

وہ کس کی ذات ہے جو رحمتِ دو عالم ہے
خلوص و عجز و محبت پیام کس کا ہے

یہ کس کے نام سے روشن ہیں علم وفن کے چراغ
برائے عالمِ امکان نظام کس کا ہے

وہ کون ہے کہ جسے کہئے محسنؐ اعظم
پیامِ خاص برائے عوام کس کا ہے

شراب خانۂ وحدت کا کون ہے ساقی
مئے طہور سے لبریز جام کس کا ہے

یہ جشن کس کی ولادت کا ہے بتائے کوئی
یہ اہتمام بصد احترام کس کا ہے

بصد خلوص جو لائے ہیں جبرئیل امیں
وہ کس بشر کے لئے ہے سلام کس کا ہے

رسول یوں تو سب ہی اسمِ با مسمیٰ ہیں
جو معجزہ ہے وہ اعجاز نام کس کا ہے

....

آپؐ کو سیدؐ عالم جو کوئی جان گیا
سچ تو یہ ہے کہ وہ اللہ کو پہچان گیا

ایسے پروانے کو کہتے ہیں بلالِ حبشیؓ
جلوۂ شمعِ رسالت پہ جو قربان گیا

آپؐ کی بات نہ مانی مرے آقا جس نے
مثلِ بوجہل وہ دُنیا سے پشیمان گیا

بخششیں آپؐ کی ہیں حسبِ مراتب سب پر
آپؐ کے در سے نہ خالی کوئی انسان گیا

اُس مسافر پہ ہوئی راحتِ دنیا صدقے
جو مدینے کی طرف بے سر و سامان گیا

ناخُدا نامِ محمدﷺ کا اثر دیکھ لیا
لے کر ساحل پہ مری ناؤ کو طوفان گیا

یہ شرف صرف شہنشاہِ دو عالمؐ کو ملا
عرشِ اعظم پہ کوئی اور بھی انسان گیا

منکرِ شانِ رسالت کی نہ بر آئی مُراد
لاکھ ایمان بچایا مگر ایمان گیا

محوِ حیرت ہے جو دُنیا تو تعجب کیسا
ان کے اعجاز پہ اعجاز بھی قربان گیا

"سرورِ کائناتﷺ"
کا شاعر
گہر اعظمی

"سرورِ کائناتﷺ" انصار الحق قریشی (گہر اعظمی) صاحب کی تصنیف ہے اور اس کا نشانِ امتیاز یہ ہے کہ یہ حضورِ اکرمﷺ کی منظوم حیاتِ طیبہ ہے۔

پیشے کے اعتبار سے مصنف انجینئر ہیں۔ تاہم ان کے ادبی ذوق کا ثبوت ان کی دیگر تصانیف بھی ہیں جن کا موضوع حمد و نعت ہے ان کے نعتیہ مجموعوں میں "ثنائے رسولﷺ"، "خیر البشرﷺ" "رب العالمین" و "رحمۃ للعالمین" اور "حضور میرے"۔ (خصوصی انعام یافتہ (وزارت مذہبی امور) شامل ہیں)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کو نعت رسولﷺ سے گہرا قلبی لگاؤ ہے اور اسی لئے ان کی بیشتر تصانیف نعت گوئی سے تعلق رکھتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "سرورِ کائنات" جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا ہے کہ ایک منظوم سوانح حیات ہے جس کا تعلق حضور اکرم کی حیات پاک سے ہے مصنف نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ صرف مستند کتابوں سے حوالے لئے جائیں اور جو بات بھی کہی جائے کسی مستند حوالے یا ماخذ کی روشنی میں کہی جائے

چنانچہ تمام حالات وواقعات کومناسب عنوانات میں تقسیم کر کے موثر انداز میں سلیقے سے بیان کیا گیا ہے کتاب کی ابتدا ان حالات سے کی گئی ہے جو چھٹی صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں اور جو اصل میں ظہورِ قدسی کا سبب قرار پاتے ہیں۔

مصنف نے واقعات کے بیان میں بے جا طوالت سے گریز کرتے ہوئے اختصار کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور بیان میں صرف انہیں واقعات یا باتوں کا ذکر کیا ہے جو عام طور پر مستند سیرت نگاروں کے یہاں مذکور ہیں۔

ہماری شاعری میں عموماً حسن وعشق کے واقعات یا داخلی اور خارجی واردات وکیفیات کا بیان ہوتا ہے لیکن نعتیہ اشعار کہنا قدرے مختلف چیز ہے، نعت گوئی ہمارے دیگر شعری اصناف سے الگ صنف ہے، نعت کہنے کیلئے نفس کی پاکیزی اولین شرط ہے، اس کے لئے خیالات وافکار کا جملہ عیوب وخبائث سے پاک ہونا اور قلب وذہن کا حضور اکرم ﷺ کی محبت میں سرشار ہونا بھی ضروری ہے۔ فاضل مصنف کے یہاں یہ عنصر بہ چیز بدرجہ اتم نظر آتا ہے، نعت کہنے کے ساتھ ساتھ حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کو منظوم شکل میں پیش کرنا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ مصنف کو پیغمبر اکرم ﷺ کی ذات وبابرکت سے غیر معمولی لگاؤ ہے۔

مصنف نے از ابتدا تا انتہا سارے واقعات وحالات کو بڑی خوبصورتی اور عمدگی سے شعر کے قالب میں ڈھالا ہے، زباں وبیان پر عبور، الفاظ کی نشست وبرخاست، اسلوب کی ندرت اور بیان کی پختگی ان کی غیر معمولی شاعرانہ

صلاحیتوں کی غمازی کرتی ہے۔

کتاب کے بغور مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ فاضل مصنف ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں ورنہ حضور اکرم ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ کو شاعری میں ڈھال دینا کوئی آسان کام نہ تھا اور وہ بھی اس طرح کہ واقعات وحالات بھی بیان ہوجائیں اور شعری محاسن بھی پوری طرح برقرار رہیں یقیناً یہ ایک عظیم اور منفرد کام ہے، واقعات کے بیان میں کسی قسم کا الجھاؤ یا ابہام نہیں ہے، تمام واقعات تاریخی ترتیب اور تسلسل سے اس طرح بیان کیے گئے ہیں گویا ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہیں، زبان عام فہم ہے اور اسلوب بیان میں روانی ودلکشی کے ساتھ پختگی اور مہارت کارفرما ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ مقدسہ کو نظم میں بیان کرنے کی یہ کوشش اُردو کی نعتیہ شاعری میں ایک نئے باب اور ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے یقیناً یہ کتاب اُردو کے نعتیہ ادب بالخصوص شاعری میں ایک گراں قدر اور مقدس و متبرک سرمائے کی حیثیت رکھے گی۔

کیف پرور نعتوں کی امین

پروین جاوید

عمومی شاعری کے برعکس نعتیہ شاعری فکر و دانش اور مہارت فن سے زیادہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ اور اُسوۂ حسنہ سے کششِ باطنی اور والہانہ لگاؤ کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ والہانہ لگاؤ جس قدر شدید و توانا ہوگا اسی قدر نعتیہ شاعری موثر اور طاقتور ہوگی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ والہانہ لگاؤ جس کا دوسرا نام عشقِ رسول ﷺ ہے ہر ایک کو نہیں کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ عشق دراصل عطیۂ وہبی یا ایک طرح کا فیضانِ الٰہی ہے جو کبھی تو لالہ صحرائی کو بھی داغِ جگر تاب کی دولت دے کر اسے پُرکشش و سرخ رو رکھتا ہے اور کبھی لعلِ بدخشاں کو شرارِ سنگ سے محروم کر کے اُسے عام پتھروں سے فروتر کر دیتا ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے دلی خوشی میسر آئی کہ پروین جاوید کو حضور اکرم ﷺ کی ذات سے نسبتِ خاص ہے اور اُنہیں عشقِ رسول ﷺ کی وہ جگر تابی میسر ہے جس کا ذکر اُوپر آیا ہے اور یہ اسی جگر تابی کا ثمرہ ہے کہ اُنھوں نے بہت جلد نعتیہ شاعری کے میدان میں اپنے لئے ایک نہایت معتبر و قابلِ توجہ مقام و مرتبہ بنا لیا ہے، اُنہیں خود بھی عشقِ رسول ﷺ کے اس فیضان کا ادراک و احساس ہے تبھی تو کہتی ہیں کہ

عشقِ احمد ﷺ ہے جو آنکھوں کو ضیاء دیتا ہے

پر یہ رتبہ جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے

زد میں آجاؤں ہواؤں کی تو پھر اس کا خیال
میری بجھتی ہوئی شمعوں کو جلا دیتا ہے

پہلے کرتا ہے مجھے خواہش دنیا سے الگ
اور پھر زیست کو احساس نیا دیتا ہے

راہ ہستی میں اگر موج حوادث ہو بلند
وہ بلندی مرے قامت کی بڑھا دیتا ہے

مجھ کو واماندگیٔ جاں سے بچانے کے لئے
اُس کا غم حوصلۂ زیست سوا دیتا ہے

اُس کی نسبت سے ہیں آباد و فروزاں ہم لوگ
ورنہ اب شہر میں آسیب صدا دیتا ہے

عشقِ احمد ﷺ کا مشرف ہے کہ جو پروین مجھے
گھپ اندھیروں میں بھی منزل کا پتہ دیتا ہے

واقعہ بھی یہی ہے کہ اللہ نے پروین جاوید کو جہاں قابلِ رشکِ تخلیقی قوت سے نوازا ہے وہیں اُنہیں نعت گوئی کا غیر معمولی سلیقہ بھی عطا کیا ہے۔ اس عطائے خداوندی کی معرفت پروین جاوید کی نعت گوئی کیسے کیسے محاسن لفظی و معنوی سے مالا مال ہوگئی ہے اور پروین نے اپنے سامع اور قاری کو کیسی کیسی معجز نمائیوں اور ہنرمندیوں سے مسحور و حیرت زدہ کیا ہے۔ مثلاً نعت کے چند اشعار

ملاحظہ کیجئے۔

فخرِ یحییٰ آپؐ ہیں میرے حضورؐ
فخر عیسیٰ آپؐ ہیں میرے حضورؐ

دو جہاں میں شانِ آدم آپؐ سے
فخرِ حوا آپؐ ہیں میرے حضورؐ

انبیاء کے آپؐ ہی سردار ہیں
سب سے بالا آپؐ ہیں میرے حضورؐ

آپؐ ابراہیمؑ و عیسیٰؑ کی دعا
وجہِ دنیا آپؐ ہیں میرے حضورؐ

باعثِ تخلیقِ عالم آپؐ ہیں
کل کے آقا آپؐ ہیں میرے حضورؐ

مجھے یہاں پروین جاوید کے اس وجدانی اور نشاط آور شعر کی بھی داد دینی ہے

غمِ دنیا سے دوری چاہتی ہوں
سرِ طیبہ حضوری چاہتی ہوں

یہ شعر فکر وفن کی لطافتوں کے جلو میں حضورﷺ سے شاعرہ کی والہانہ عقیدت وفریفتگی کی معرفت انبساطِ روح کا ایسا سامان فراہم کر رہا ہے کہ وجدان جھوم جھوم جاتا ہے۔ ذہن عش عش کر اُٹھتا ہے اور زبان پر بے ساختہ سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد جاری ہو جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس شعر میں ارتعاشِ جذبات کا

اظہار مضطربانہ آرزومندی کے ساتھ ایسے خوبصورت انداز میں ہوا ہے کہ اس سے بہتر صورت کا امکان نہیں رہتا۔ ایک نعت کے اشعار اور دیکھتے چلیے۔

کُھلے لب حبیبِؐ خدا کہتے کہتے
دوبارہ ملے مصطفیٰؐ کہتے کہتے

ہوئی دل کو تسکیں دعا پڑھتے پڑھتے
مقدر بنا مجتبیٰؐ کہتے کہتے

ہے قدسی کو بھی قُربِ ربُّ العلیٰ کا
ملا ہے حبیبِؐ خدا کہتے کہتے

خدا کی قسم آپؐ یوسف نظر ہیں
چھپے چاند تارے ثنا کہتے کہتے

شفیعُ الامم ہی کریں گے شفاعت
یہ زاہد رہیں یا خدا کہتے کہتے

شرف بازیابی کا اُس کو ملے گا
حرم جو گیا مصطفیٰؐ کہتے کہتے

خطا کار پر بھی کرم کی نظر ہو
کٹی عمر یہ مدعا کہتے کہتے

بھنور سے بچا لوں گی میں اپنی کشتی
حبیبِؐ خدا نا خدا کہتے کہتے

میں پروین جاوید کو فکر وفن کی اس غیر معمولی دسترس پر مبارکباد دیتا ہوں اور اُنہیں صفِ اوّل کے نعت نگاروں میں شمار کرتا ہوں۔ ان کی ساری نعتیہ شاعری خواہ وہ نعتیہ غزل کی صورت میں ہوں خواہ رباعیات وقطعات کی شکل میں جملہ لفظی ومعنوی محاسن سے مالا مال ہے اور قاری پر نہایت خوشگوار و حیرت انگیز اثر ڈالتی ہے۔ یہاں چند قطعات اور رباعیات پیش کرتا ہوں۔

اخلاق کی تعبیر وہی کرتے ہیں
قرآن کی تفسیر وہی کرتے ہیں
وہ جن کو بنایا گیا محبوبِ خدا
انساں کی بھی تعمیر وہی کرتے ہیں

اِک متاعِ یقین ملی ہم کو
زندگی یوں حسیں ملی ہم کو
حُبِّ احمدؐ کے جب امین ہوئے
اِک بہشتِ بریں ملی ہم کو

نبیؐ کے عشق کا چمکا نگینہ
مجھے آیا ہے جینے کا قرینہ
کوئی دوری گوارا اب نہیں ہے
سوئے طیبہ چلا میرا سفینہ

مجھ کو توفیق سفر کی دے دو
سفرِ گنبدِ خضرا مولا
میں کہ عاصی و خطا وار سہی
مجھ کو دو اپنی تمنّا مولا

پروین کی نعتیہ شاعری میں روضۂ اقدس کی زیارت کا جو ذوق وشوق بھرپور انداز میں اُبھرتا نظر آتا ہے وہ ان کے عشقِ رسول ﷺ کی گواہی ہے۔

''چرخِ اطلس''
کا شاعر
محبوب الٰہی عطا

جنابِ عطاؔ کی نعتیہ رُباعیات کا مجموعہ ''چرخِ اطلس'' میرے سامنے ہے اور میں لطف اندوزی کے ساتھ آنحضرت ﷺ پر درود و سلام بھیج رہا ہوں کہ حکمِ ربی بھی یہی ہے اور ایک مسلمان کی خوش نصیبی بھی یہی ہے۔

عطاؔ کی رباعیوں پر نظر ڈالی تو پہلا احساس تو یہ ہوا کہ وہ محض موزوں طبع شاعر نہیں بلکہ زبان و بیان پر مکمل قدرت رکھنے والے فطری شاعر ہیں، تبھی تو انہوں نے شعر گوئی کیلئے رُباعی جیسی مشکل ہیئت کو اپنایا ہے اور اپنے اُوپر موضوع کی قدغن بھی لگالی ہے، موضوع بھی کیسا؟ لطیف ترین و عظیم ترین جس کی مدح و ثناء، خود ربّ کریم کرتا ہے اور اپنے بندوں کو بھی اس کا حکم دیتا ہے۔

عطاؔ نے صنفِ رُباعی کی ہیئت اور موضوع کی عظمت کو جس فنکارانہ صلاحیت اور خلاقانہ لطافت کے ساتھ برتا ہے اُس کا تقاضا تو یہی ہے کہ عطا کی نعتیہ رباعیات کا مفصل جائزہ لیا جائے، لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسا کرنے سے اشعار کی اثر پذیری میں کسی نوع کا اضافہ ممکن نہ ہوگا۔ نثر کی زبان اور نثر کا اسلوب، ہرگز شعر کی زبان اور شعر کے اسلوب کا ہم پلّہ نہیں ہوسکتا، اس دعوے کے لئے دلیل درکار ہو تو کسی بھی شعر کی نثر بنا کر دیکھ لیجئے، کیسی ہی لطیف و لذیذ

نثر کیوں نہ ہو، شعر کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتی، کم سے کم لفظوں میں دلکش صوتی آہنگوں کے ساتھ خیال کو لفظی پیکر میں ڈھالنے یا شعر کا قالب دینے کا حُسن و اثر ہی کچھ اور ہوتا ہے اس لئے میں عطاؔ کی رُباعیات کے تجزیاتی مطالعے میں نہ جاؤں گا ہاں چند ایسی منتخب رباعیات ضرور آپ کے سامنے رکھ دوں گا جن سے آپ بقدرِ ذوق و عقیدت اپنا کام بھی نکال سکیں گے اور عطا کے کمالِ فن کی داد بھی دے سکیں گے، سو ذیل کی چند رُباعیات پر نظر ڈالئے اور اپنے ذوقِ سخن کی تسکین کا سامان فراہم کیجئے۔

خالق کا ہے ممدوح سراپا تیرا
رتبہ ہے ہر اک رتبے سے اعلیٰ تیرا
تعریف لکھیں کیا تیری انشا پرداز
ہر وصف ہے تعریف سے بالا تیرا

خالق سے عطاؔ مانگ کے ہم نے توفیق
اس بات کی اچھی طرح کر لی تحقیق
دکھلائے جو تصویر محمدؐ کی عطاؔ
آئینہ ہوا ایسا نہ کوئی تخلیق

تصویر نمائی کے قرینے ہیں کئی
عکسِ رخِ احمدؐ کے نگینے ہیں کئی
یثرب ہی نہیں شاہِ مدینہ کا مکاں
ہو دیدۂ بینا تو مدینے ہیں کئی

خوشیوں کی حکایت ہو کہ افسانۂ غم
جو کچھ بھی ہے لولاک لما سے ہے رقم
آغازِ ابد ہو کہ ہو تمہید حدوث
عنواں ہے بہرنگ رخِ شاہِ اُممؐ

تشبیہ کو تنزیہہ سے تابندہ کیا
سرکارؐ نے یکتائی کو رخشندہ کیا
کثرت سے جدا کر کے شیونِ وحدت
توحید کو تجدید سے پائندہ کیا

اسرار کی تشہیر کیے بیٹھے ہیں
افلاک کو زنجیر کیے بیٹھے ہیں
عشاقِ نبیؐ عشقِ محمدؐ میں عطا
کونین کو تسخیر کیے بیٹھے ہیں

اِن رُباعیوں کے چاروں مصرعوں کے ارتقائے فن پر نظر ڈالیں گے تو اندازہ ہوگا کہ پہلا مصرعہ، رُباعی کے موضوع کی نشاندہی کرتا ہے۔ دوسرا مصرعہ اس نشان کو کچھ اور اُجاگر کرتا ہے، تیسرا مصرعہ معنی کی مجمل تصویر پیش کرتا ہے اور چوتھا مصرعہ، پوری رُباعی کے بند قبا کو اُس طرح کھول دیتا ہے کہ آپ سبحان اللہ و صلی اللہ علی وسلم کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کم و بیش یہی کیفیت ساری رُباعیوں کی ہے۔

طاہر سلطانی
کی
نعتیہ شاعری

اس وقت میرے پیشِ نظر طاہر سلطانی صاحب کی صرف ''نعتیہ شاعری'' ہے لیکن اُن کے معمولات زندگی اور ترجیحاتِ فکروفن کے پس منظر پر غور کرتا ہوں تو اُن کی حمدیہ شاعری بوجوہ اُن کی نعتیہ شاعری سے بھی پہلے میرے سامنے آجاتی ہے اور مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ طاہر سلطانی صاحب نعت کے ساتھ ساتھ حمد کے بھی نہایت کامیاب و معتبر شاعر ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ حمدیہ شاعری کے فروغ و اشاعت کے سلسلے میں اُن کی کاوشیں معمولی نہیں غیر معمولی ہیں۔ یہ تو حمد و مناجات کے مستجاب ہونے کا ثبوت و انعام ہے کہ ان کی نعت گوئی اپنی اثر پذیری و سیرت میں حمد سے ہم رنگ ہے اور ان کی حمد کی طرح مقبول خاص و عام ہے۔

ان کا مجموعہ کلام ''ہر سانس پکارے صلِ علیٰ'' اپنے نام کی مناسبت سے صرف نعتوں پر مشتمل ہے، سب جانتے ہیں کہ اصناف شاعری کی تاریخ میں نعت ایک انتہائی منزّہ و پاکیزہ اور متبرک و مقدس صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا اوّلین و اساسی موضوع حضور اکرم ﷺ کی مدح و ثنا ہے نعت کی صنف، دوسری اصناف سخن کی بہ نسبت زیادہ مشکل و نازک بھی ہے۔ اس صنف میں طبع آزمائی کے لئے حرارت ایمان و پاکیزگی جذبات و محسوسات کے دوش بدوش

حضور اکرم ﷺ کی ذات صفات سے والہانہ محبت بھی درکار ہوتی ہے۔ بغیر اس کے نعت الفاظ و ہیئت کا جامہ پہن کر بھی نعت نہیں ہوتی، طاہر سلطانی صاحب کے یہاں حضور اکرم ﷺ سے والہانہ اظہار بھی ہے اور اظہار میں وجدانی کیفیت کی سرشاری بھی چنانچہ اُن کی نعت سن کر اور پڑھ کر ان کے قاری کا وجدان بھی جھوم جھوم اُٹھتا ہے اس وجدانی کیفیت کی شدّت کو الفاظ کی گرفت میں لانا ممکن نہیں اس لئے بطور مثال اُن کے چند نعتیہ اشعار دیکھتے چلیے۔

یہ آپ کے دل میں وہ لطافت و کیفیت اتار دیں گے جن کا اظہار میں کرنا چاہتا ہوں اور جو اس وقت لفظوں کی گرفت میں نہیں ہیں۔

بیٹھے ہی بیٹھے حاضری کوچے میں اُن ﷺ کے ہوگئی
یہ ہے درودِ پاک کے کیف و سرور کا کمال

بے حُبِ مصطفےٰ ﷺ ہے تو بیکار ہے حیات
اُن ﷺ کی طلب میں گزرے تو انوار ہے حیات

اب زندگی خوشی میں بسر ہو کہ غم کے ساتھ
ہوں مطمئن کے آپ ﷺ کی نسبت ہے دم کے ساتھ

یہ آرزو ہے مرنے سے پہلے میں ایک بار
دیکھوں عطائے خاص کا درِ رحمتِ تمام

نعت میری زندگی ہے نعت ہی سے پیار ہے
نعت ہی کا میرے دل میں ایک حسیں گلزار ہے

طاہر سلطانی صاحب کی نعتوں کے بہ غور مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ عشقِ رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ طاہر سلطانی کے یہاں توحید و رسالت کے عقیدے اور نازک رشتے اور ان کے اپنے جذبات و احساسات اور افکار و خیالات کے اظہار میں بھی ایک طرح کی ہم آہنگی اور یگانگت پائی جاتی ہے اور ان کی نعت گوئی میں جو ایک خاص کشش پائی جاتی ہے وہ اسی سبب سے ہے۔ ان کی نعتوں میں سچے نعت گو شعراء کی طرح آنحضرت ﷺ سے عقیدت و محبت کا جوش و خروش اور آپؐ کے روضۂ اقدس کی زیارت کا ذوق و شوق بھرپور انداز میں اُبھرتا نظر آتا ہے۔ ان کی نعتوں میں جو سرمستی اور سرشاری اور کیف و سرور کی کیفیت نظر آتی ہے وہ انہیں جذبات و احساسات کا فیضان ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

طاہرؔ کسی کے در سے بھلا کیا غرض مجھے
کافی ہے مجھ کو نسبتِ سرکار ﷺ کی کرن

پہنچ کے کوچۂ آقا ﷺ میں دم نکل جائے
اس اہتمام سے روشن ہیں حسرتوں کے چراغ

فضائے مدینہ ہے کیا اللہ اللہ
سماتے نہیں ہیں نظر میں اُجالے

ہو میسّر جو مجھے خاکِ مدینہ یارب
میرا مدفن مرے آقا ﷺ کا نگر ہوجائے

طیبہ کی حاضری کے لئے دل ہے بے قرار
کب پورا ہوگا دل کا یہ ارمان دیکھئے

ایمان جسے ہم کہتے ہیں وہ حُبِّ نبی ﷺ کا حاصل ہے
جب یاد ہو ان کی راہنما ہر سانس پکارے صلِّ علیٰ

حاضری کی جو تمنا ہے نبی ﷺ کے در پہ
واسطہ دے کر نبی ﷺ کا وہ مہینہ مانگو

سوچتا ہوں کیا مدینے جاؤں گا میں کبھی
یہ تمنّا جانے کب ہوگی مری آراستہ

خدا شاہد یہی اب جستجو ہے
مدینہ دیکھنے کی آرزو ہے

زباں خاموش آنکھیں نم ہیں میری
نبی ﷺ کا روضہ میرے رُوبرو ہے

درِ نبی ﷺ پہ ہی گزرے یہ باقی عمر مری
ہے زندگی میں مجھے ایسی زندگی کی تلاش

طاہر سلطانی صاحب کی نعتیہ شاعری کے مطالعے کے بعد جو بنیادی بات قاری کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حمد ونعت اُن کا محبوب مشغلہ وموضوع ہے اوراس کی بنیاد ،وراس کا محرک اُن کی حرارتِ ایمانی اور آنخضرت ﷺ کی ذاتِ مقدسہ ۔ ،والہانہ عقیدت وشیفتگی ہے اوراسی سرمایۂ عشق ومحبت کووہ اپنے لئے ذریعۂ نجات اورذریعۂ مغفرت سمجھتے ہیں۔اُن کی نعتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نعت گوئی اُن کے مضطرب دل اور بے قرار روح کیلئے باعثِ تسکین اور موجبِ راحت ہے،ان کے ایک ایک شعر میں حضور ﷺ کی عقیدت ومحبت جھلکتی ہے اورعشقِ رسول ﷺ کی مستی وسرشاری میں ڈوبی ہوئی یہ فضا پڑھنے والے کی آنکھ بھی نم کردیتی ہے۔مثلاً اس نوع کے اشعار

مدینے کی جب یاد آتی ہے دل کو
تو پلکوں پہ موتی سجاتے ہیں آنسو

اُن ﷺ کے دیدار کی حسرت میں بہا کر آنسو
اپنے جذبات کا اظہار کریں ہیں آنکھیں

روضہ شاہِ امم ﷺ سے ہے عقیدت طاہؔر
اُن ﷺ کی گلیوں سے بڑا پیار کریں ہیں آنکھیں

جالیاں روضہ اقدس کی نظر سے چوموں
روضۂ شاہ کی توقیر رہے آنکھوں میں

غرض کے طاہر سلطانی کی حمدیہ اورنعتیہ تصانیف اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ شاعر کوحمد ونعت سے ایک قلبی وروحانی وابستگی ہے اورحضور اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے بے پناہ لگاؤ ہے اوراسی عشق کوانہوں نے بڑی مہارت اور فن کاری وعقیدت مندانہ جذبہ کے تحت بڑی خوبی سے شعر کا قالب دیا ہے۔ بلاشبہ اُن کی نعتیں اُردو شاعری میں ایک نمایاں اور لائقِ تحسین اضافہ ہیں اور حقیقت میں یہی نعتیہ شاعری ان کی شہرت وعظمت کا بلکہ ہرنعت گو کی شہرت کا سبب ہے بقول شاعر

مدحتِ سرکار ﷺ کے صدقے میں اے طاہؔر میاں
ہر ثنا خواں کے لئے شہرت کے دروازے کھلے

عبدالمالک مضطر
کی
نعتیہ شاعری

خوش نصیب ہیں، ''آرزو'' کے خالق جناب مضطرؔ جنہوں نے شاعری کی جملہ ہیئتوں اور تازہ بتازہ زمینوں میں نعت کے نغمے بکھیرے ہیں۔ نعت کے بارے میں ان کا زاویہ نظر مضطرؔ کو رسمی نعت گو شعراء کی صف سے الگ رکھ کر ان نعت گو شعراء کے زمرے میں شامل کر دیتا ہے جس میں مولانا الطاف حسین حالیؔ، مولانا محمد علی جوہرؔ، ظفر علی خاںؔ اور علامہ اقبال وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

''آرزو'' میں جذباتِ ملّی کا وہی تموّج، فکرِ ذہنی کا وہی مدّ و جزر، اور دردِ قومی کا وہی ارتعاش نظر آئے گا جو اقبال کی نظموں کا طرّہ امتیاز ہے۔ مضطر نے علامہ سے رسمی اور سطحی انداز سے استفادہ نہیں کیا بلکہ علامہ کے فکر و جذبہ سے فطری اور والہانہ سرشاری کے زیرِ اثر اُن کی شاعری کو اپنی نعتیہ شاعری کا محور بنانے کی کوشش کی ہے۔ مضطر کی نعتیہ شاعری اُردو کی مروّجہ روشِ نعت گوئی سے بہت الگ ہے۔ وہ اُردو کے عام نعت گو شعراء کی طرح صرف غزل کی ہیئت میں اسیر ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ انہوں نے اُردو نعت کو حسنِ خیال و حسنِ عمل دونوں اعتبار سے ملک و ملت کے درد کا درمان اور زخمِ دل کا مرہم بنا دیا ہے۔

اُوپر میں نے عبدالمالک مضطر کو رسمیہ نعت گوئی کے سلسلے سے الگ

نعتیہ شاعری کے اس قبیلے سے منسلک کیا ہے جس میں علامہ اقبال اور حالی وغیرہ کے نام آتے ہیں یعنی رسمیہ نعت گوئی سے ہٹ کر جن کی پوری شاعری کا محور حضور اکرم ﷺ کی ذات رہی ہے اور جنہوں نے اپنی تمام شاعری کو خواہ ہیئت کے اعتبار سے کسی بھی شکل میں ہو اسوۂ رسول ﷺ کے تابع رکھا ہے۔ مضطر کی شاعری بھی اسی نوعیت کی ہے۔ ان کی نظموں میں پہلی قابلِ ذکر نظم جو حمد و نعت دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ''آرزو'' کے نام سے مسموم ہے۔

ان کی اس قسم کی نظمیں ان کے کلام میں درج ہیں۔ اور ان سب کو شاعر نے ''آرزو'' کے عنوان سے اپنے مجموعہ کلام میں شامل کیا ہے یہ نظمیں مختلف ہیئتوں میں ہیں مضطر کی نظمیں فکر انگیز ہیں۔ ان کی نظموں میں کئی تضمینیں بھی شامل ہیں یہ تضمینیں فارسی شعراء اور اُردو شعراء دونوں سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں۔

اُردو شعراء کی تضمینوں کے حوالے سے پہلی قابلِ ذکر غالب کے کلام سے متعلق ہے غالب کی بہت مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے

نویدِ امن ہے بے دادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

غالب کی یہ غزل اتنی فکر انگیز ہے کہ تضمین کے ذریعے اسے آگے بڑھانا ممکن نہ تھا لیکن مضطر کی قادر الکلامی اور حضور ﷺ کی ذات و صفات سے بے پناہ لگاؤ نے انہیں کامیاب کیا اور انہوں نے غالب کی پوری غزل کو اپنی ایک تضمین میں اس طرح سمو لیا کہ غالب کی غزل کی لطف اندازی دو چند ہو گئی اس

تضمین کو دیکھتے چلئے اور میرے دعوئے کی حسبِ مقدر تائید کیجئے۔

پیامِ رنگ و بہاراں ہے گلستاں کے لئے
نسیمِ صبح، رحیلِ سفر خزاں کے لئے
ہے افتخارِ قلم، شرف ہے زباں کے لئے
ہوں وقف مدحِ نبی ﷺ کے یہ گریباں کے لئے
مگر نہ لفظ ہوں بس زیبِ داستاں کے لئے
صدا و صوت کا پیمانہ عز و شاں کے لئے
نہ ایک رسم یہ ہوجائے حرزِ جاں کے لئے
نہ ہو وظیفہ محض، ورد بس زباں کے لئے
بنے یہ گردشِ خوں جذبہء نہاں کے لئے
صدا جرس کی ہو ملت کے کارواں کے لئے
چراغِ راہ رہے روح و جسم و جاں کے لئے
نبی ﷺ کا اسوہ ہے ہر دور، ہر زماں کے لئے
یہی براق ہے معراجِ آسماں کے لئے
کمندِ شوق ہے تسخیرِ کہکشاں کے لئے
نہائے اوج، مہ و مہر ضوفشاں کے لئے
یہ ہے حصار بلاؤں سے آشیاں کے لئے
یہ منفعت کا ہی سودا ہے نقدِ جاں کے لئے

ہے زندگی کی کسوٹی یہ امتحاں کے لئے
اک انقلاب کی دعوت ہے اِنس و جاں کے لئے
''فروغِ عشقِ نبی ﷺ، روشنی جہاں کے لئے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے''

شاعری اپنی دل آویز و نظر گیری تخلیق کے لئے بالعموم قوتِ متخیّلہ چاہتی ہے، حساس طبیعت کی متقاضی ہوتی ہے، زبان و بیان یعنی اظہارِ خیال پر قدرتِ کاملہ کا تقاضا کرتی ہے، رموزِ بحر و قافیہ سے کما حقہ واقفیت بھی چاہتی اور حسنِ خیال و حسن الفاظ کی ہم آہنگی کے ادراک کا بھی مطالبہ کرتی ہے، مگر شاعری کی بعض شاخیں ایسی بھی ہیں جو اپنی بالیدگی و تر و تازگی اور شادابی و ثمر باری کے لئے کچھ اور لوازم بھی چاہتی ہیں۔ مثلاً نعتیہ شاعری، دوسرے لفظی و معنوی اوصاف کے ساتھ ساتھ شاعر سے حضورِ اکرم ﷺ کی ذات و صفات سے خاص لگاؤ کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ لگاؤ جس قدر توانا اور والہانہ ہوگا اُسی قدر نعتیہ شاعری دل آویز و کارگشا ہوگی، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں نعتیہ شاعری محض کسبِ ہنر اور ریاضتِ فن کے ذریعے اثر انگیز اور کارگر نہیں ہوتی۔ نعت گوئی دراصل ایک طرح کا عطیہِ خداوندی اور توفیقِ الٰہی ہے جو سب کو نہیں، کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ خوش نصیب ہیں جناب عبدالمالک مضطر جنہیں یہ توفیق میسر ہوئی ہے اور جنہوں نے شاعری کی جملہ ہیئتوں اور تازہ بتازہ زمینوں میں نعت کے نغمے بکھیرے ہیں۔ یہ بات میرے لئے باعثِ طمانیت ہے کہ توفیقِ الٰہی اور

نعت گوئی کے باب میں میرے خیالات اور مظہر صاحب کے خیالات ایک سے ہیں، تبھی تو جو بات میں نے اُوپر اپنی بے کیف نثر میں کہی ہے، وہ بات خود انہوں نے نہایت خوبصورت انداز میں اس طور پر کہہ دی ہے

ڈر ہے انجانے میں ہو جائے نہ کچھ بے ادبی
اس تصور سے ہی آجاتی ہے پلکوں پہ نمی
اس تڑپ اور لگن میں کبھی آئے نہ کمی
ہو میسر مجھے اس رہ میں حضورِ قلبی
یہ سعادت ہے مگر کم کے مقدر میں لکھی
یہ تو بس دین ہے، توفیق و عطائے ربی

نعت اور نعت گوئی کے بارے میں یہی وہ زاویہ ہے جو مظہر کو نعت گو شعراء کی صف سے الگ رکھ کر ان نعت گو شعراء کے زمرے میں شامل کر دیتا ہے جس میں مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال وغیرہ کے نام آتے ہیں اور جو اپنی نعت گوئی کو فلاحِ ملک و ملّت اور فلاحِ دارین سے وابستہ رکھنے کو اپنا فرضِ عین جانتے ہیں۔

عبدالمالک مظہر کی نعتوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مظہر نے فکرِ ذہنی اور جذبہ ملّی کے سلسلے میں سب سے زیادہ اثر علامہ اقبال کا ہی قبول کیا ہے۔ یہ بات اس لئے کہی جا رہی ہے کہ مظہر کی نعتیہ شاعری عموماً اس زمین اور بحر میں ہے جسے علامہ اقبال نے اپنی طویل اور بہترین قومی نظموں کیلئے اپنایا

ہے۔ یہ بات اب بھی واضح نہ ہو سکی ہو تو مظہر کی نعتوں کو دیکھتے جائیے، ساری نظمیں علامہ اقبال کی مشہور نظموں شکوہ و جوابِ شکوہ، جیسی نظموں کی بحر و زمین میں ملیں گی اور ان میں آپ کو جذباتِ ملّی کا وہی تموّج، فکرِ ذہنی کا وہی مد و جزر اور دردِ قومی کا وہی ارتعاش نظر آئے گا جو علامہ اقبال کی نظموں کا طرّہ امتیاز ہے یعنی ان کی بحریں بھی وہی ہیں جو اقبال کی بعض نہایت دقیع نظموں کی ہیں۔ اقبال کی نظم ''والدہ کی یاد میں'' اور ''ہمالہ'' کو ذرا ذہن میں اُبھاریئے اور پھر مظہر کی منظومات کو دیکھئے، صاف اندازہ ہو جائے گا کہ مظہر نے علامہ سے رسمی اور سطحی استفادہ نہیں کیا بلکہ علامہ کے فکر و جذبہ سے فطری اور والہانہ سرشاری کے زیرِ اثر اُن کی شاعری کو اپنی نعتیہ شاعری کا محور و پیکر بنانے کی کوشش کی ہے۔

مختصراً کہنا صرف اس قدر ہے کہ مظہر کی نعتیہ شاعری اُردو کی مروّجہ روشِ نعت گوئی سے بہت الگ ہے۔ وہ اُردو کے عام نعت گو شعراء کی طرح صرف غزل کی ہیئت میں اسیر ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ انہوں نے اُردو کو حسنِ خیال و حسنِ عمل دونوں اعتبار سے ملک و ملت کے درد کا درماں اور زخمِ دل کا مرہم بنا دیا ہے۔

''حمد وثناء''
نثار بیانوی کا
شعری مجموعہ

حمد ونعت وسلام وقصائد پر مشتمل شعری مجموعہ ''حمد وثناء'' اس وقت میرے سامنے ہے اور میں اس مجموعۂ شاعری کے خالق نثار بیانوی کی خلاقانہ صلاحیت اور عالمانہ بصیرت کی داد دینے پر خود کو مجبور پاتا ہوں۔

اگر یہ جبر وتقاضا اُن کی ذات کی طرف سے ہوتا تو میں شاید اس سے سرسری گزر جاتا لیکن یہ جبر چونکہ صاحبِ کلام سے آگے بڑھ کر خود کلام کی طرف سے ہے اس لئے بقدرِ استعداد، اس سے لطف اندوز ہونے اور داد دینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

علم بیان ومعنی کی کتابوں میں محاسن شعر کی ضمن میں صدہا صنعتیں اور ہزار بدعتیں درج ہیں اور اشعار میں اُن کے استعمالات کی امثال بھی دی ہوئی ہیں لیکن صنائع وبدائع کی جیسی کرشمہ سازی، زیرِ نظر مجموعے میں مجھے دکھائی دی، دوسری جگہ بہت کم نظر آئی ہے، صرف یہی نہیں کہ ایک ایک لفظ، موتی کی طرح پوری آبداری کے ساتھ اشعار کی لڑیوں میں پرویا ہوا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ، حسن کاری وطلسم سازی کا بے مثال اور لاجواب منظر پیش کرتا ہے۔ حرکات وسکنات نے اس منظر میں دل کشی ونظر گیری کی ایسی

جوت جگائی ہے کہ بعض اشعار کے سامنے آتے ہی واہ واہ سبحان اللہ کے کلمات خود بخود قاری کی زبان پر آجاتے ہیں۔

پروفیسر قیصر نجفی اور سید قمر حیدر نے ''حمد وثناء'' کے اس نوع کے محاسنِ شعری پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے اور سخن شناسی کا حق ادا کیا ہے۔ اس لئے نثار بیانوی کے مجموعہ کلام کے محاسن کی تفصیل میں میرا جانا اور مزید کچھ کہنا محض تکرار کہلائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ مثال کے طور پر نثار بیانوی کی وہی مرصع منقبت جس کے زیر زبر پیش تک دلوں میں نشتر اُتارتے ہیں پوری کی پوری قارئین کی نذر کردی جائے اور شاعر کے کمالاتِ فکروفن کو بے چوں وچرا قبول کرلیا جائے منقبت یہ ہے

حَل ہوئے آنسو نِگل کر مَرحلے مُشکِل کے کُل
جس طرح پانی سے گل جاتے ہیں کچّے گِل کے گُل

گُل فشاں ہیں مصطفےٰ نخلِ امامت ہے نہال
کھل رہی ہے خامشی طبع رسا کچھ کَھل کے کُھل

سب کے مولاؑ ہوگئے ہیں ساقیِ خُمِ غدیر
آج تو اے بے عَمل محفل میں پی لے مِل کے مُل

پھر خُدا نے بھی نہ بخشا کر دیا دوزخ رسید
جب گئے اعمالِ مقتل، حشر میں قاتل کے تُل

مَشغلۂ حُبِ علیؑ کے رنگ لائے اے نثار
کر رہے ہیں حشر میں شیخ و مُغَل شاغل کے غُل

''حمد وثناء'' کے قارئین سے میری گزارش ہے وہ اس مجموعہ شعری کو معمولی نہ جانیں، یہ کرامت وزن و بحر اور صداقت لفظ و بیان کے تعلق سے غیر معمولی مجموعہ ہے اور تخلیق و تحسین کے جذبات کو بے ساختہ اُبھارنے کے ساتھ ساتھ تنقید کی بھی راہیں دکھاتا ہے۔

آخر میں نثار بیانوی کی دو نعتیں بھی دیکھتے چلئے تا کہ اُن کے کمالِ نعت گوئی کا اندازہ آپ خود کرسکیں۔

سمٹ کر اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ ولا آئے
محمد ﷺ عظمتِ انساں لئے جب برملا آئے

کہاں ہیں طالبِ انسانیت، شاہِ ہُدا آئے
صلائے عام ہے سلطان آئے یا گدا آئے

صدا احمد ﷺ نے دی خیبر میں، ہو جو منچلا، آئے
جسے حیدر ﷺ سے لڑنا ہو وہ میداں میں چلا آئے

کلام اللہ آنا چاہتا ہے اپنے مرکز پر
اب ایسے میں ضرورت ہے کہ قلبِ مصطفےٰ ﷺ آئے

شبِ معراج فرقِ دو کماں ہی کہہ دیا یکسر
کہ قربت میں ضیا و مہر کی ایک فاصلہ آئے

....

زہے عز و شانِ جناب محمد ﷺ
خطابِ خدا ہے خطابِ محمد ﷺ

حقیقت کے جلوے نظر آگئے ہیں
اُٹھایا کبھی جب نقابِ محمد ﷺ

قیامت جسے کہہ رہا ہے زمانہ
حقیقت میں ہے وہ شبابِ محمد ﷺ

زباں پر درود و سلام آگئے ہیں
جو دل نے کہا ہے جنابِ محمد ﷺ

ہر اک نکتہ اک دفترِ رازِ عرفاں
ہے قرآنِ عالم کتابِ محمد ﷺ

رضی عظیم آبادی
کی
نعتیہ شاعری

نعتیہ شاعری بھی شاعری کی دوسری شاخوں کی طرح فکروفن کی توانائیوں اور زبان وبیان کی رعنائیوں کی متقاضی ہوتی ہے لیکن نعت میں اثر پذیری ودلکشی کے حقیقی آثار فکری وفرضی لوازم سے بہتر بلکہ عقیدت کی شدت اور محبت کی حدت سے پیدا ہوتے ہیں چنانچہ نعت گو شاعر کا حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے جتنا گہرا تعلق ہوگا اسی تعلق کی نسبت سے اس کے نعتیہ کلام میں نظرگیری ودل فریبی کا سامان ہوگا۔ حاجی رضی عظیم آبادی کی نعتیہ شاعری اسی لئے قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے کہ ان کا جذبہء عشق جو رسول اکرم ﷺ کی ذات اور ان کے اسوۂ حسنہ سے وابستہ ہے ان کے اشعار کے ایک ایک نقطہ اور ایک ایک حرف سے اُمڈ پڑتا ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں رسماً نہیں بلکہ عشقِ رسول ﷺ کی شدت کے زیرِ اثر کہہ رہے ہیں تب ہی تو ان کا نعتیہ کلام ''آئینہ یزداں'' قاری کو ہر لفظ ہر نگاہ دادوتحسین پر مجبور کرتا ہے صرف بطورِ مثال چند اشعار دیکھئے اور لطف اندوزی کے ساتھ رضی عظیم آبادی کی نعتیہ شاعری کی داد دیجئے۔

مچل رہا ہے قلم ہمارا کہ نعتِ احمدؐ رقم ہو کیسے
اِسی میں گم ہے خیال اپنا کہ حرف شایانِ شاں نہیں ہے

''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''
اعلان ہو رہا ہے یہ پیہم اذان سے

ڈوب کر کیف میں جو نعت کہی جاتی ہے
عرش والوں کی، وہ محفل میں سنی جاتی ہے

کیسے واپس ہوں دیارِ شہہ کونین سے ہم
ہر گلی پاؤں کی زنجیر بنی جاتی ہے

یہ ہم پہ رضیؔ ان کی عنایت کا اثر ہے
جوشستہ، شگفتہ مرا اندازِ بیاں ہے

اُس کی رضا پہ شانِ کریمی بھی ہے نثار
راضی نہ کیوں رضیؔ ہو نبیؐ کی رضا پہ ہم

رضی عظیم آبادی کا معتبر غزل گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ معتبر نعت گویان میں بھی شمار ہونے لگا ہے۔ ان کا طرزِ فکر اور اندازِ نعت گوئی نے ان کی شاعرانہ شخصیت کو بھی یہ امتیاز بخشا اور اُردو کے جدید نعت گویان کو بھی رتبہء اعتبار پر فائز کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے شاعر اور شاعری کے کون کون سے اوصاف سامنے رکھے ہیں اور نعت گوئی کے لئے کن کن شرائط کو پورا کرنا ضروری جانا ہے؟

اس کی تفصیل ان کی زبان سے سننے کے لائق ہے چند اشعار دیکھتے چلئے۔

کہنے کو نعت گوئی کا جذبہ حسین ہے
لیکن رضیؔ یہ مرحلہ نازک ترین ہے

پہلے ہوائے نفس کو زنجیر کیجئے
پھر اسوۂ رسولؐ کی تفسیر کیجئے

شرح ممکن ہی نہیں مصطفیٰؐ کی شان کی
اسوۂ خیر الوریٰ تفسیر ہے قرآن کی

رضیؔ عظیم آبادی نے نعت گوئی میں کس طرح کامیابی حاصل کی اور معیارِ سخن کو کس طرح برقرار رکھا اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ کامیابی انہیں خلوصِ محبت اور عشقِ رسول ﷺ ہی کے سبب میسر آئی ہے۔ ایک نعت بطورِ نمونہ پیش کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

زمانے میں سب سے حسیں ہیں محمدؐ
دلوں میں ہمارے مکیں ہیں محمدؐ

نہیں کوئی غم مجھ کو روزِ جزا کا
شفاعت کو جب بالیقیں ہیں محمدؐ

وہ خضرا کے جلووں کا عالم نہ پوچھو
کہ سائے میں جس کے مکیں ہیں محمدؐ

میسر نہیں جو کسی گلستاں کو
وہ اک خوشبوئے دلنشیں ہیں محمدؐ

زمانہ ہو دشمن کے چرخِ کہن ہو
مدد کو پکارو وہیں ہیں محمدؐ

خدا نے کیا کیوں طلب آپ ہی کو
رسولوں میں ایسے نگیں ہیں محمدؐ

رضیؔ کو ہو کیا غم جو سب ہیں مخالف
میرے دل میں جب جاگزیں ہیں محمدؐ

''چراغ مصطفوی ﷺ''

سراج الدین سراج

کا مجموعۂ کلام

''ہوا اور چراغ'' کے تعلق سے اکثر شعراء نے زندگی کے نشیب و فراز اور حادثات و امکانات کو موضوع بنایا ہے اور بعض نے بہت اچھے اشعار نکالے ہیں۔ آپ کے ذہن میں اس نوع کے اشعار ضرور ہوں گے لیکن اس موضوع کے حوالے سے جب ممتاز نعت گو شاعر جناب سیّد سراج الدین سراج کا یہ بے مثال نعتیہ شعر

نسبت مجھے چراغِ رسالت سے ہے سراؔج
دیکھوں گا میں بھی حوصلہ کتنا ہوا کا ہے

میری نظر سے گزرا تو میں چونک پڑا۔ یقیناً یہ شعر اپنے موضوع کی عظمت اور شاعری کی بلندیِ فکر کا اعتراف کرتا ہے اور بے مثال ہے۔ یہ شعر سراج کے نعتیہ کلام کے ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے لیکن آپ نے بلند مرتبہ صوفی شاعر خواجہ میر دردؔ کا یہ شعر تو ضرور سنا ہوگا

ہر جزو کو کُل کے ساتھ بے معنی ہے اتصال
دریا سے دُر جدا ہے پہ ہے غرقِ آب میں

دردؔ کا شعر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جزو کی عظمت و اہمیت کل کی

عظمت و اہمیت کا اشاریہ و استعارہ ہوتی ہے۔ جناب سراج کے شعر کی یہی صورت ہے اور اس کی نعتیہ شاعری کی بلندی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں رہا جاتا۔

سراج الدین سراج کا نعتیہ مجموعہ ''چراغِ مصطفویؐ'' کے حوالے سے علامہ اقبال کا یہ شعر بھی خود بخود ذہن میں اُبھرا اور سراج الدین سراج کی علوئے فکر کی طرف اشارہ کرتا ہے، اقبال کا شعر ہے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرار بو لہبی

اس شعر میں حق و باطل کی ساری جنگ کو اپنے اندر سمیٹ لیا گیا ہے لیکن فارسی میں ہونے کے سبب اس کا اثر و نفاذ اُردو کے قارئین تک پوری طرح نہیں پہنچا۔

سراج الدین سراج نے اپنی نعتیہ شاعری کے ذریعے اپنی نعتوں کے مجموعے کو ''چراغِ مصطفویؐ'' سے موسوم کر کے اقبال کے شعر کی اثر اندازی کو بہت آگے بڑھا دیا ہے۔

سراج الدین سراج ایک قادر الکلام شاعر ہیں اور انہوں نے اپنے نعتیہ جذبات کو مشکل اور آسان ہر قسم کی زمینوں میں ڈھال دیا ہے مثلاً ان کی ایک نعت کا مطلع ہے

دستِ قدرت نے ترا شا حق کا مظہر آئینہ
خود ہوا شیدا بنا کر آئینہ گر آئینہ

اس مطلع میں مظہر اور آئینہ کے الفاظ بطور قافیہ استعمال ہوئے ہیں جب کہ آئینہ کا مصرف بطورِ ردیف ہوا ہے۔اب اگر قافیے اور ردیف کو ملا کر اس نعتیہ غزل کی زمین کو دیکھئے تو آسان نہیں رہتی، بہت مشکل ہو جاتی ہے اور اس زمین میں اچھے شعر نکال لینا بہت مشکل ہے۔ لیکن سراج الدین سراج کی قادر الکلامی نے اسی زمین ایسی خوبصورت مکمل نعت کہہ دی ہے کہ ان کے جذبات ومحسوسات کے ساتھ ساتھ ان کی زبان وبیان اور اسلوبِ دل نشینی کی داد دینی پڑتی ہے آپ بھی یہ نعت دیکھئے اور لطف اندوزی کے ساتھ سراج الدین سراج کی قدرتِ کلامی کی داد دیجئے۔

دستِ قُدرت نے تراشا حق کا مظہر آئینہ
خود ہوا شیدا بنا کر آئینہ گر آئینہ

شہرِ سُلطانِ دو عالم کی بہاریں دیکھ کر
چشمِ بینا پر ہوا جنت کا منظر آئینہ

دیکھ لیتا خوش نصیبی سے جو شہکارِ ازل
توڑ دیتا ضربِ نفرت سے سکندر آئینہ

ہاتھ کی ساری لکیریں خطِ روشن بن گئیں
ہوگیا ان کی عنات سے مقدر آئینہ

جگمگائے جس کی ضو سے محفلِ ﷺ کون ومکاں
شیش محلوں کو کہاں ایسا میسّر آئینہ

تابشِ کون ومکاں ہے ان کے چہرے پر نثار
ہر تجلّی نے بنایا اپنا محور آئینہ

تا کہ دنیا کو نظر آجائیں اپنے خدو خال
لائے ہیں قرآن کی صورت پیمبر آئینہ

رکھ دیا اپنا قلم یہ کہہ کے اُس معبود نے
اب قیامت تک نہ ہوگا اِس سے بہتر آئینہ

دیدِ سرکارِ دو عالمؐ میں تڑپتا ہوں سراج
خواب ہی میں دیکھ لیتا نورِ پیکر آئینہ

سراج الدین سراج نے رُباعیات وقطعات کی صورت میں بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے بطورِ نمونہ ان کا کلام دیکھئے اور داد دیجئے

بجز مصطفٰےؐ اور کوئی نہیں ہے
ہے کس کی نبوت ازل سے ابد تک

کسی عہد تک منحصر وہ نہیں ہے
ہے ان کی رسالت ازل سے ابد تک

حاصلِ دولتِ ایماں ہے رسولِ عربیؐ
حشر میں سب کا نگہباں ہے رسولِ عربیؐ
تیری تعریف میں عاجز ہے لب و دہنِ سراج
خود ثنا خواں ترا قرآں ہے رسولِ عربیؐ

محفلِ کونین کا آغاز ہے عشقِ نبیؐ
دورِ پُر آشوب میں دمساز ہے عشقِ نبیؐ
دل میں روشن ہوں خلوص و عجز و ایماں کے چراغ
خامشی اظہار ہے آواز ہے عشقِ نبیؐ

یہ مرتبہ خاص کسے اور ملا ہے
جو عظمت و توقیرِ رسولؐ کا دوسریٰ ہے
کیا سمجھتے ہیں بشر رفعتِ سرکارِ دو عالمؐ
تخیّل کی پرواز بھی گردِ کفِ پا ہے

"المدد یا سیدی یا رحمت للعالمین"
راؤ مبین
کا نعتیہ مجموعہ

راؤ مبین علیگ کی نعتوں کا مجموعہ "المدد یا سیدی یا رحمت للعالمین" اس وقت میرے پیش نظر ہے اور میں اس پر مبصرانہ نظر ڈالنے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کی ساری نعتیں غزل نما ہیں، یعنی غزل کی ہیئت اور غزل کے فارم میں ہیں۔ بحور، اوزان، ردیف و قافیہ کے نظام اور اسلوب سب میں کلاسیکی غزل کا رچاؤ صاف نظر آتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

درود جب سے ہمارے لبوں کی زینت ہے
عجیب کیف میں ڈوبی ہوئی طبیعت ہے

مرا جو شغل شہہِ دوسرا کی مدحت ہے
کرم حضور کا اللہ کی عنایت ہے

مجھے بھی بھیک ملے پنجتن کے صدقے میں
تمہارے در کی جہاں میں حضور شہرت ہے

جو اشک میں نے لٹائے ہیں یادِ طیبہ میں
تمام عمر کی پونجی ہے میری دولت ہے

فرشتے فخر کریں جس کا تذکرہ کر کے
ثنائے رحمتِ عالم ہی وہ عبادت ہے

وہ بخشوائیں گے محشر میں ہے یقیں مجھ کو
کہ درگزر ہی شہہِ انس و جاں کی عادت ہے

بہے جو اشک مسلسل تو یہ ہوا محسوس
غمِ نبی میں نہاں بے کراں مسرت ہے

غزل کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ خواہ اُس کا تعلق زندگی کے کسی پہلو سے بھی ہو وہ عاشقانہ اور محبوبانہ لہجے میں ہی اپنی طرحداریوں کا اظہار کرتی ہے۔ گویا غزل کی سچی اور دل میں اُتر جانے والی شاعری، ہمیشہ عاشقانہ اور معصومانہ جذبوں کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ یہی سچے اور حقیقی جذبے جب دنیا کی عظیم ترین شخصیت، انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار اور رحمتہ اللعالمین سے ملقب دنیا کے سب سے بڑے آدمی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں تو غزل کی معنوی حیثیت یکسر بدل جاتی ہے، اپنی ظاہری ہیئت میں غزل اگرچہ غزل ہی رہتی ہے لیکن اس کی روح عام غزل سے بہت مختلف ہو جاتی ہے۔ اور اُس کا نام غزل کی بجائے نعت ہو جاتا ہے۔ چند اشعار دیکھتے چلیے:

یاد سرکار کی جس دل کو جلا دیتی ہے
اس کو مسکن شہہِ والا کا بنا دیتی ہے

جب بھی آتی ہے ہوا شہرِ حبیبِ حق سے
ایک اِک گوشے کو خوشبو سے بسا دیتی ہے

صدقہ مانگے تو سہی کوئی شہہِ بطحا کا
ہر نفس رحمتِ یزداں تو صدا دیتی ہے

ایک اُمیدِ حضوری ہے جو ہے وجہِ سکوں
تھپکیاں دے کر غمِ دل کو سلا دیتی ہے

کیوں نہ روشن کریں ہم شمعِ رسالت دل میں
ظلمتوں میں بھی جو اِک راہ دکھا دیتی ہے

ایک اور نعت کے چند اشعار پیش کرتا ہوں

اب بلا بھی لیجئے دربار میں یا مصطفےٰ
عمر گزری یہ حسرتِ دیدار میں یا مصطفےٰ

آ رہا ہوں آپ کی سرکار میں یا مصطفےٰ
ہے تغیر کس قدر رفتار میں یا مصطفےٰ

مجھ سے بھی توصیف کا حق کچھ تو ہو جائے ادا
اتنی کچھ پرواز ہو افکار میں یا مصطفیٰ

حُسنِ یزداں کی تجلّی دیکھنے کے واسطے
آ گیا ہوں آپ کی سرکار میں یا مصطفیٰ

سر ندامت سے جھکا ہے اور آنکھیں اشکبار
لے کر آیا ہوں گُہر سرکار میں یا مصطفیٰ

زندگی مل جائے مجھ کو اِک جھلک سے آپ کی
کچھ نفس باقی ہیں اب بیمار میں یا مصطفیٰ

غم نے بخشی ہے مسرت ہی مسرت ہر نفس
اشک بہتے ہیں اِسی اظہار میں یا مصطفیٰ

اچھی اور قابلِ توجہ نعتیہ شاعری، کسی شاعر سے نہ تو عروض و قواعد پر ماہرانہ دسترس کا مطالبہ کرتی ہے اور نہ غیر معمولی علم و فضل کا تقاضا، بلکہ نعتیہ شاعری تو ایک شاعر سے صرف یہ چاہتی ہے کہ وہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ سے والہانہ لگاؤ رکھتا ہو، یہ لگاؤ جتنا شدید اور جتنا گہرا ہوگا اُسی نسبت سے نعتیہ شاعری اپنے اثر و کیف میں گہری اور شدید ہوگی۔ مجھے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے یہ لگاؤ راؤ مبین کے یہاں نظر آتا ہے، چنانچہ اُن کی نعتیں بھی اُن کی غزلوں کی طرح ظاہر میں بہت سادہ لیکن باطن میں حد درجہ پُرکار اور حیات افروز ہیں۔

"ساقیِ کوثر ﷺ"

خان اختر ندیم نقشبندی

کا نعتیہ مجموعہ

"ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم" خان اختر ندیم نقشبندی کا نعتیہ مجموعہ ہے اور متعدد صاحبانِ فکر و نظر کے تعارفی شذرات و تقریظات سے مزین ہو کر، خاص اہتمام سے پھلیلی حیدر آباد سے شائع ہوا ہے۔ یہ نعتیہ مجموعہ کس پائے کا ہے، اور حسنِ ظاہری و باطنی کے اعتبار سے اُردو کی نعتیہ شاعری میں کیا مقام ہے اِس سلسلے میں چند آراء دیکھ لیجیے

سید حسین علی ادیب رائے پوری

"ان کی شاعرانہ صلاحیت، سے پہلے ان کی خوش بختی قابلِ ذکر ہے کہ ان کا شمار مدح گسارانِ حبیب خدا میں ہو گیا۔ جس کی ذاتِ والاصفات کے عشق نے مدحت سرائی کی منزل تک پہنچا دیا۔ وہ شعر و سخن میں کمال کی منزل تک بھی پہنچا دے گا۔"

عتیق احمد جیلانی

"خان اختر ندیم نے جدید و قدیم نعت گویوں سے بھرپور فیض اٹھایا ہے اُن کے کلام میں نعت کے حوالے سے وہ تمام موضوعات و خیالات یکجا ہو گئے ہیں جو دیگر اہلِ کمال

کے ہاں بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے بڑی محنت سے ایک ایک پھول کو چنا اور بڑی محبت سے یہ گل دستہ تیار کیا۔ رشتہ جاں میں پروئے ہوئے یہ سدا بہار پھول روحانی مسرت کا سامان اور فکری طہارت کا نشان ہیں۔"

یہ صاحب الرائے اور بامطالعہ اہل قلم کی رائیں ہیں اور ان میں اختر ندیم نقشبندی کے نعتیہ مجموعہ شعری کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق وصداقت پر مبنی ہے۔ براہ راست، حسن وصداقت سے ہمکنار ہونے کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ ایک نظر، اُن کے مجموعے "ساقی کوثر" پر ڈال لیجئے اور پھر خان اختر ندیم کی شاعری کی داد دیجئے۔ میں یہاں ایک نعت کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

مجھے بھی گنبدِ خضرا دکھا دو یا رسول اللہ
مری سوئی ہوئی قسمت جگا دو یا رسول اللہ
تمہاری دید کو اک عمر سے آنکھیں ترستی ہیں
بجھا دو پیاس آنکھوں کی بجھا دو یا رسول اللہ
مجھے سرشار کردو اپنے کیف آگیں نظارے سے
شرابِ دید کا ساغر پلا دو یا رسول اللہ
تمہیں دیکھیں گے ہم تو دیکھ لیں گے ربّ اکبر کو
دکھا دو اب رُخِ زیبا دکھا دو یا رسول اللہ
وہاں کی خاک کے ذرے ہیں سچے موتیوں جیسے
مدینے کا مجھے منگتا بنا دو یا رسول اللہ

"خورشیدِ بطحا"

حنیف ساجد

کا نعتیہ مجموعہ

حنیف ساجد کا نعتیہ مجموعہ "خورشید بطحا" کے نام سے جنوری ۲۰۰۶ء میں سرگودھا سے شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ اُردو کی نعتیہ شاعری میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ ہر چند کہ حنیف ساجد غزل کے شاعر ہیں بایں وہمہ نعتیں بھی خوب کہتے ہیں۔ یہ نعتیں بظاہر غزل کی ہیئت میں ہیں اور زبان و بیان کی سادگی کے سبب حلقہ خاص و عام دونوں میں قبولیت کے امکانات رکھتی ہیں۔ مجھے حنیف ساجد کے پاکیزہ جذبات اور اِن کے جذبات کو قرینے سے اشعار میں ڈھال دینے کی صلاحیت دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ اگر اُنہوں نے مشقِ سخن جاری رکھی اور نعت کے موضوع سے اُن کی دلداری کا یہی عالم رہا تو وہ بہت جلد اُردو کی موجودہ نعتیہ شاعری کا ایک تازہ باب رقم کریں گے۔ اس جگہ بلا انتخاب ایک مختصر سی نعت دیکھئے یہ اُن کے مجموعہ نعت "خورشید بطحا" کے صفحہ ۳۳ پر شائع ہوئی ہے۔

لبوں پہ حرفِ درود رکھنا نظر میں اُن کا جمال رکھنا
نبی ﷺ کی چاہت قدم قدم پر گرہ دل میں سنبھال رکھنا

اُنہی کی صورت مسافتیں اور اُنہی کی صورت قیامِ منزل
عقیدتوں کے سفر میں ہر دم اُنہی کی روشن مثال رکھنا

محبتوں کے سفر میں شعلے کہیں پہ سنگِ ستم کے طوفاں
نبی ﷺ کی راہوں پہ زندگی ہو تو کچھ نہ دل میں ملال رکھنا

یہی ہے شہرِ بدن کی ظلمت کا سب سے بہتر علاجِ آخر
دِلوں کی تیرہ شبی میں ہر دم اُنہی کا نورِ جمال رکھنا

حیا کے پردوں میں آنکھیں رکھنا لہو کی گردش میں انکی یادیں
سماعتوں میں ہمیشہ اُن کے حروفِ ذکرِ کمال رکھنا

اُنہی کی عظمت بیان کرنا سلام پڑھنا حنیف ساجد
محبّتوں کی رَوِش رَوِش پر ادب کا لیکن خیال رکھنا

یہ مردّف نعت، قافیوں کے جمال وجلال کے ساتھ حرف وصوت کے جملہ محاسن کو جس طرح اپنے اندر سموئے ہوئے ہے وہ حنیف ساجد کے معیارِ نعت گوئی پر دلالت کرتا ہے۔اس جگہ کتاب کے سرورق کا شیخ سعدی کے مندرجہ ذیل نعتیہ قطعہ سے مزین ہونا بھی قابلِ ذکر بات ہے

بَلَغَ العُلےٰ بِکَمالِہٖ
کَشَفَ الدُّجےٰ بِجَمالِہٖ

حَسُنَت جَمِیعُ خِصَالِہٖ
صَلُّوا عَلَیہِ وَ آلِہٖ

یہ نعتیہ قطعہ شیخ سعدی کے شعری کلیات میں نہیں بلکہ اُن کی مشہور زمانہ کتاب ''گلستاں'' کے دیباچے میں مرقوم ہوا ہے اور دُنیائے شاعری میں اپنی غیر معمولی مقبولیت کے سبب تقریباً دنیا کی ہر زبان میں بطور تضمین استعمال ہوا ہے اور شاعروں کی توجہ کا مرکز بننے کے ساتھ ساتھ صاحبانِ ذوق کے مطالعے کا مرکز رہا ہے حنیف ساجد کو ندرتِ احساس وحسن کی دولت کے ساتھ ساتھ الفاظ کے برمحل مصرف اور حسنِ استعمال کی حیرت انگیز قدرت وقوت حاصل ہے۔مناسب الفاظ کے چناؤ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نعتیہ شاعری کی حیثیت سے اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔یہاں ایک نعت کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں

آنکھوں میں عکسِ گنبدِ خضریٰ سجا ہوا
دل پر ہو کاش! میرے محمدؐ لکھا ہوا

نعتِ نبیؐ کے پھول ہوں شاخِ زبان پر
پلکوں پہ ہو چراغِ عقیدت جلا ہوا

سر میں سما رہا ہو اُنہی کا جنونِ عشق
یادوں کا سلسلہ ہو بدن میں بسا ہوا

پاؤں میں ہوں مسافتِ بطحا کے آبلے
ہاتھوں کا ہو دعاؤں سے کاسہ بنا ہوا

اُن کا ہی ذکر زیبِ سماعت ہو روز و شب
حرفِ درود ہو مرے لب پر سجا ہوا

"الہام"

خالدعرفان

کا نعتیہ مجموعہ

نعت کی شاعری حضورِ اکرم ﷺ کی ذات وصفات سے گہرا شغف اور لگاؤ رکھتی ہے۔ یہ میسر آجائے تو زمین، وزن و بحر، قوافی و ردیف اور لگاؤ و تراکیب میں سب کے سب شاعر کے مُطیع و فرمانبردار بن جاتے ہیں۔

خالدعرفان کے یہاں مجھے یہ شغف اور لگاؤ نظر آتا ہے۔ نتیجتاً اُن کی نعتیہ شاعری اُن کے سارے اوصاف سے مُتصّف ہوگئی ہے۔ جن کا وجود اچھی شاعری کی ضمانت دیتا ہے۔ چند اشعار دیکھتے چلیے۔

سرکارؐ کے اوصاف میں تحریر لکھی جائے
قرآن صفت ذات کی تفسیر لکھی جائے

اوصافِ نبیؐ لِکھنا کوئی کھیل نہیں ہے
ایسا ہی ہے جیسے کوئی تصویر لکھی جائے

اے کاتبِ تقدیر ہوں مدّاحِ نبیؐ میں
جبریلؑ کے پَر سے میری تقدیر لکھی جائے

جس زاویہء عشق سے چاہو انہیںؐ لکھو
مقصد یہ ہے کہ سرکارؐ کی توقیر لکھی جائے

مِل جائے اگر خاکِ کفِ پائے محمدؐ
خالد مرضِ عشق میں اِکسیر لکھی جائے

خالد عرفان کی نعتیں صرف اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی ہیں ایک نعت اور پیش کرتا ہوں۔

دلوں سے عشقِ نبیؐ کا نشاں نہیں جاتا
عقیدتوں کا سفر رائیگاں نہیں جاتا

وہاں پہ جاکے ہوئے سب ہی زندۂ جاوید
یہاں بھی زندہ نہیں جو وہاں نہیں جاتا

حضورؐ! مجھ کو بھی خیراتِ موسمِ گُل کی
مری حیات سے دورِ خزاں نہیں جاتا

وہؐ اس مقامِ رسالت پہ ہوگے فائز
کسی بشر کا تخیُّل جہاں نہیں جاتا

ہوں جس محاذ کے سالارِ جنگ میرے نبیؐ
عُدو وہاں سے کبھی کامراں نہیں جاتا

اگر سلیقہ طرزِ بیاں بھی ہو خالدؔ
وہاں سے دستِ طلب رائیگاں نہیں جاتا

خالد عرفان کے بیشتر اشعار دل کو لگتے ہیں اور زبان سے سبحان اللہ کہلواتے ہیں۔ فنِ شعر کے حوالے سے یہ حُسنِ کمال نہیں بلکہ حُسن کی دلیل ہے۔ مثلاً یہ نعت دیکھئے۔

امین ٹھہرے، امان ٹھہرے
حضورؐ رحمت نِشان ٹھہرے

نہ ہو زمیں پر جو سبز گنبد
تو کِس طرح آسمان ٹھہرے

خدا نے مدعو کیا تھا اُنؐ کو
خدا کے وہ مہمان ٹھہرے

درود پڑھتا رہوں ہمیشہ
کبھی نہ میری زبان ٹھہرے

زمین کی پستیوں میں خالدؔ
وہ عظمتوں کے نشان ٹھہرے